چنگ و رباب

کنہیا لال کپور

پبلشرز
انڈین اکیڈمی۔ ریگل بلڈنگ۔ نئی دہلی

قیمت:- دو روپے پچاس نئے پیسے

بار دوم تعداد ۱۰۰۰

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی ۶

فہرس

انکی رحیبھ گسدنبہ ا

ع ہم اُلٹے - بات اُلٹی - یار اُلٹا!

پیش لفظ

اِس کتاب کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے نام کا اِس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ نام تجویز کرتے وقت مَیں نے شیکسپیئر کے اُس مقولے پر عمل نہیں کیا جس میں کہا گیا ہے۔ "آخر نام میں کیا دھرا ہے"۔ بلکہ شاعرِ انقلاب (جونیئر) کے اُس مصرع پر جس میں تلقین کی گئی ہے کہ ؎

تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

مَیں نے سنگ و خشت سے تو نہیں البتہ "سنگ و خشت" کے لیے "چنگ و رباب" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے شاعرِ انقلاب اِس معمولی فرد گذاشت کو نظر انداز فرمائیں گے۔

مشہور فرانسیسی طنز نگار والٹیئر نے ایک جگہ کہا ہے۔ "اچھے مصنّفوں کو

دو چیزوں سے احتراز کرنا چاہیئے: "خودنمائی" اور "پیش لفظ" لکھوانے سے۔ جو اچھے مصنف نہیں اُنہیں ایک تیسری چیز سے احتراز کرنا چاہیئے۔ یعنی "لکھنے سے" والٹیئر نے بات پتے کی کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص سے پیش لفظ لکھوانے کی بجائے خود لکھ رہا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہے یہ بھی ایک طرح کی "خودنمائی" اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں واقعی اپنا شمار اچھے مصنفوں میں کرتا ہوں!

"چنگ و رباب" کے مضامین میں حیرت انگیز تنوّع تو نہیں۔ البتہ کافی تندہی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض مضامین ضرورت سے زیادہ تشنہ اور مختصر رہے۔ تندی کے علاوہ ان مضامین میں زبان کی متعدد غلطیاں بھی ہوں گی۔ جن کی تمام تر ذمہ داری کاتب پر نہیں مصنف پر عائد ہوتی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ "تعارف" محض ضخامت میں چند صفحوں کا اضافہ کرنے کے لئے شامل کیا گیا ہے۔ جب یہ مضمون پہلی بار "ادب لطیف" میں چھپا۔ تو اسکا عنوان "تعارف" نہیں بلکہ "بچھو" تھا۔ ملاحظہ ہو "ادب لطیف" اگست ۱۹۴۵ء

ڈی اے وی کالج

لاہور

مئی ۱۹۴۶ء

کنہیا لال کپور

تعارف

کنہیالال کپور کی ہر چیز انوکھی ہے۔ حتےٰ کہ اُس کا جسم بھی۔ اُسے دیکھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے اور معجزوں کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اُس کے جسم کی تخلیق میں خدا نے یہ نکتہ رکھا ہے کہ گوشت اور پٹھے کہیں استعمال نہ کئے جائیں۔ اُس کا جسم قوسوں اور دائروں کا مرہونِ منت نہیں۔ صرف زاویوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اُس کے چہرے کے متعلق سب سے حیران کن انکشاف یہ ہے کہ خدا نے اُسے آنکھوں سے محروم کر رکھا ہے۔ بظاہر اس کے چہرے پر دو آنکھیں ہیں۔ لیکن در حقیقت ان میں سے ایک خوردبین اور دوسری دُوربین ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ایک تیسری غیر مرئی آنکھ بھی ہے۔ جو بھگوان شنکر کی روایتی آنکھ کی طرح کبھی کبھی کُھلتی ہے۔ مگر جب کُھلتی ہے تو ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آنکھ ابھی تک تو صرف دو بار ہی کھولی گئی۔ اس کا قہر مادی گنگ و جمن پہ نازل ہوا۔ گو

اس واقعہ کو ایک عرصہ ہو گیا۔ لیکن اب بھی ستلج پار سے کراہنے کی آوازیں اکثر آیا کرتی ہیں۔

وضاحت (CLARITY) اُس کا خاص وصف ہے۔ سوائے جسم کے اُس کے ہاں کوئی چیز پیچیدہ نہیں۔ وہ دماغ ہے، محض دماغ جیسے خدا نے اپنا سارا زور اُس کے دماغ پر صرف کر دیا اور اس کا سارا جسم دماغ کی طرف کھچ آیا۔ اُس کے لئے نہ جسم کی ضرورت تھی۔ نہ دل کی۔ لیکن ازلی اور ابدی قوانینِ قدرت کے مطابق جسم کے بغیر دماغ اور دل کے بغیر جسم کا وجود ممکن نہیں۔ اس لئے اُسے یہ بے مصرف چیزیں بھی مہیا کر دی گئیں۔ کپور کے جذبات اور احساسات کا سرچشمہ دماغ ہے۔ وہ دل سے نہیں، دماغ سے محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل "لغوی" اور "مجازاً" اس کے جسم کا سب سے نحیف و نزار حصّہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دل کے فرائض بھی دماغ ہی سر انجام دیتا ہے۔ بادی النظر میں وہ غم، غصّہ، خوشی، محبت، نفرت اور رحم کے جذبات سے عاری نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ اس کے جذبات و احساسات منظرِ عام پر آنے کے لئے ایسے ایسے سوانگ بھرتے ہیں کہ وہ سطحی مشاہدے سے نہیں پہچانے جا سکتے۔ درحقیقت اُس میں یہ تمام جذبات عوام کی نسبت کہیں شدت سے نمودار ہوتے ہیں۔ یہی شدت اُس کے طنز کی محرک ہے۔ اگر کنہیا لال کپور محض جسمانی طور پر ہی نہیں۔ واقعتاً بھی مجنوں ہوتا۔ اور اُسے کسی لیلےٰ سے عشق ہوتا تو عشق کی تکمیل کے لئے وہ ایک نئی راہ تلاش کرتا۔ صحرا نوردی اور دشت پیمائی اُسے بے معنی معلوم ہوتی۔ وہ سایۂ دیوار میں راتیں گزارنے کے خیال کو بھی ٹھکرا دیتا اور اپنی تمام تر قوتیں اُس احمقوں کی دنیا کی تخریب کے لئے مجتمع کر دیتا جس میں مجنوں

لیلےٰ کا قرب حاصل نہیں کر پاتا۔ وہ ایک نئے جہان کی تعمیر کے ارادے باندھتا۔ جس میں لیلےٰ اور اُس کے ناقہ محل سرے سے ہی غائب ہوتے۔ اُس کی لیلےٰ شاید اُسے کوستی۔ شاید اُس کی محبت پر شک کرتی۔ اُس پر بے وفائی کا الزام لگاتی اور روایتی محبت کا ہدیہ نہ پاکر مایوس ہوجاتی۔

کپور ہر قسم کی ذہنی کشمکش سے بے نیاز ہے۔ اُس کے خیالات و جذبات کی مملکت کا نظام جمہوری نہیں، تسلطائی ہے۔ جہاں اُس جذبے، اُس احساس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جو اس مملکت میں رخنہ پیدا کرے۔ وہ ایسے خیالات کو بے رحمی سے دبا دیتا ہے۔ اُس کی شامیں کتنی ہی کثیف اور اُداس کیوں نہ ہوں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اُتارنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ایسا ممکن بھی ہے۔ وہ ایسے "جذباتی" حادثات سے کلیتہً بالاتر ہے۔ "وثوق" اُس کی سرشت کا اہم ترین عنصر ہے۔ سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کے انداز سے لیکر خدا اور کونین کے پیچیدہ مسائل تک ہر شئے کے متعلق اُس کا اپنا نظریہ ہے۔ اور اُس کا استدلال اپنے نظریے کی صداقت ثابت کرنے کے لئے ہزارہا دلائل ہر وقت تیار رکھتا ہے۔ اُس کی فطرت میں ایک ہم آہنگی ٹھہراؤ اور توازن ہے۔ مگر یہ وثوق، ہم آہنگی اور توازن وہ نہیں جو ایک خوفناک اندرونی کشمکش کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ بطور فنکار یہی اُس کی فتح ہے اور یہی شکست!

اُس کی سرشت "ارتقائی عمل" نہیں ایک "تکمیل ہے۔ اُس کی تعمیر اُسی دن مکمل ہو چکی تھی۔ جب دن وہ پیدا ہوا تھا۔ ماحول، حادثات روزگار۔ بوقلموں تاثرات باہمی تعلقات ——— کوئی چیز اُسے جو بھر نہیں بدل سکتی۔ وہ دُنیا میں

یونہی آیا اور یونہی رخصت ہوجائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بسترِ مرگ پر بھی اُس کے لبوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ رقصاں ہوگی جو زندگی بھر اُس کا شیوہ رہی ہے۔ قضا و قدر اُسے جنت میں بھیجے یا جہنم میں۔ وہ کہیں بھی مطمئن نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر جگہ تخریب و تعمیر کے نکتے پیدا کرتا رہے گا۔ مثلاً حضرت جبریل سے پہلی ہی ملاقات میں کہے گا کہ "حضرت! آپ کا جبہ و عمامہ فرسودہ ہو چکا۔ کوٹ پتلون نہیں تو کم از کم شیروانی ہی پہنا کیجئے!" روزِ محشر اپنے دوستوں سے اپنی مخصوص بے تکلفی سے ملے گا، اور اُن کی شکل و شباہت، عادات و اطوار پر وہی بے لاگ مگر شوخ تبصرے گا۔ جو اس دنیا میں کرتا رہا۔ اگر اُسے جنت میں بھیجا جائے تو کسی کونے میں بیٹھا، سفید ریش زاہدوں کو حور و غلمان کی پھبتیوں اور قہقہوں کا تختۂ مشق بنتے دیکھ کر زیرِ لب مسکرائے گا۔ اور جب فرشتے اُسے یادِ گاہ الٰہی میں لے جائیں گے تو وہ خدا تعالیٰ ارض و سما کے حضور میں سجدہ کرنے کے بعد کہے گا۔ "اے رحیم! تیری رحمت کے صدقے، تیری حکمت کے قربان، تو نے اُن لوگوں کو جنت بخشی جنہیں حوروں سے بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں اور جنہیں غلمان کو مخاطب کرتے ہوئے لکنت ہوتی ہے۔

کپور کی شخصیت کا موازنہ کارلائل اور ورڈز ورتھ سے نہیں والٹیئر اور سوفٹ سے کیا جا سکتا ہے۔ اُس کی روح میں جنون و خرد کبھی برسرِ پیکار نہیں ہوتے۔ وہ اُن فنکاروں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ جن کی نظریں ہمیشہ مادی دنیا پر رہتی ہیں جو صرف اُنہیں چیزوں پر ایمان لا سکتے ہیں۔ جو عقل و استدلال کے دائرے کے اندر ہوں جو اس دنیا کے صابون کے مستند مگر فرسودہ نظام کو بدلنے کی استطاعت تو رکھتے ہیں مگر جن کا مطالعہ اور مشاہدہ بہر کیف سطحی ہوتا ہے

جنہیں اُن ازلی اور ابدی سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی تحریک نہیں ہوتی جو دُنیا بھر کے مذاہب، فلسفہ اور آرٹ کے محرک ہوئے۔ کپور ان سوالات کو فضول سمجھتا ہے۔ اور اُن کا جواب تلاش کرنے والوں کی نیّت کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اُس نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ خرد فقط چراغِ رہگذر ہے۔" درونِ خانہ" جو ہنگامے ہوتے ہیں۔ اُن کی اُسے خبر تک نہیں ہوتی اور اُسے یہ احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی رُوح میں امن و سکون ہے۔ اُسے کبھی یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ہم کیوں جیتے ہیں اور آیا انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔

باتیں بنانا ہی اُس کا محبوب شغل ہے۔ اس کے مضامین بھی باتیں ہیں۔ وہ باتیں جو تحریر میں آگئی ہیں۔ وہ ہر ایک بات میں نکات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا ہر دوسرا فقرہ چست اور ہر تیسری ترکیب حیاق چوبند نظر آتی ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک طمانچہ اور ہر شوشہ ایک چپت ہے۔ الفاظ اُس کے لئے چھوٹے چھوٹے سنگریزے ہیں۔ جنہیں وہ اپنی زبان کے گوپیئے میں رکھ کر زور سے گھماتا ہے۔ اور اس انداز سے پھینکتا ہے کہ لوگ سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ قاری کو ہر ناممکن اور ناقابلِ قبول نظریئے کا قائل بنا دینا اُس کا سب کا مرغوب شعبدہ ہے اور اس شعبدے کی تکمیل کے لئے سب سے مؤثر حربہ اُس کی" ذہنی دہشت انگیزی" ہے۔ مثلاً آپ پہلی ہی ملاقات میں اُس کے سامنے کسی مسلم الثبوت اُستاد کی تعریف کیجئے، تو وہ اُس پر جھپٹ پڑے گا۔ اور آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے تار و پود بکھیر کر رکھ دے گا۔ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے اُستادِ اعظم کو سسکیاں بھرتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھیں گے۔ اس" بلٹزکریگی" (BLitz Croig)

عمل کے بعد آپ کو اس "ادبی نسطائی" کے سامنے سر جھکاتے ہی بنے گی۔

عورت کے متعلق اس کا یہ نظریہ ہے کہ وہ صرف جسمانی حسن پر مرتی ہے۔ اُسے اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ جسمانی طور پر وہ کسی لڑکی کیلئے باعث کشش نہیں بن سکتا۔

اُس کی عقابی آنکھوں سے کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔ وہ اپنے عزیز ترین دوست کے مضحکہ خیز پہلو پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اُس کی رفتار، لب ولہجہ، عادات واطوار، حتےٰ کہ مانگ نکالنے کا طریق تک اُس کی نظروں سے محفوظ نہیں۔ اُس کے طنز ومزاح کا سب سے بڑا مرکز خود اُس کی شخصیت ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو کبھی نہیں چھپاتا۔ بلکہ اُنہیں منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اُن پر لوگوں کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور نہ صرف خود اُس ہنسی میں شریک ہوتا ہے بلکہ اُس کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا ہے۔ اُس کی "اینٹیں اور پتھر" لوگوں کو ہی نشانہ نہیں بناتے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی اُن نشانہ بناتا ہے۔ وہ دُنیا کو آئینہ ضرور دِکھاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے چہرے کے بدنما دھبے اس میں دیکھ سکیں۔ مگر اُسے اس آئینہ میں خود اپنا منہ دیکھنے میں بھی باک نہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ اُس کے چہرے پر اُس کی ناک کے سوا کوئی چیز اُبھری ہوئی نہیں مگر پھر بھی وہ اُس ناک کی نمائش کرنے سے گریز نہیں کرتا اور ستم یہ ہے کہ دیکھنے والوں سے داد بھی چاہتا ہے۔ وہ کبھی پارسائی کا دعوےٰ نہیں کرتا۔ کسی کو دھوکہ دیتا بھی ہے تو اعلانیہ اسے جتا کر۔ وہ شبخون کا قائل نہیں۔ دن دہاڑے حملہ کرتا ہے۔ چوری پر وہ سینہ زوری کو ترجیح دیتا ہے۔ اُس کے متعلق یہ نظریہ قطعاً غلط ہے۔ کہ اُسکی آستین میں دشنہ پنہاں ہوتا ہے اور ہاتھ میں نشتر کھلا۔ اُس کے ہاتھ میں دشنہ

کھلا ہو تو ہو لیکن اس کی آستین میں سوائے کلائی کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی ہے مگر وہ آپ برداشتہ استعمال کرتا ہے تو پہلے پوچھتا ہے "کیوں صاحب بسم اللہ کروں!"

ابھی تک اُس نے چار پانچ تین کتابیں اور چند ادیب پیدا کئے ہیں۔ خود لکھنے سے زیادہ وہ دوسروں کو لکھنے کی ترغیب دینے کا قائل ہے۔ نوگرفتار، نوآموز، نومشق ادیبوں کے لئے وہ پیر و مرشد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گم راہ خضر ہے جس کا کام دوسروں کو راہ دکھانا ہے۔ وہ خود کم لکھتا ہے اور دوسروں سے زیادہ لکھواتا ہے۔ اُس کا زرخیز دماغ نئے نئے پلاٹ اور موضوعات اختراع کرتا ہے جنہیں وہ فراخدلی سے بانٹ دیتا ہے۔ وہ دوسروں کی املا۔ انشا اور ٹیکنیک کی غلطیاں درست کرتا ہے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ان کا مقالہ یا افسانے نئے سرے سے تحریر کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے "لو میاں۔ اب اسے جہاں چاہو بھیج دو۔"

یکور نہ پیغمبر ہے نہ فلسفی، نہ خطیب ہے نہ مصلح قوم اُسے نہ شوقِ نمود ہے نہ اعترافِ شکست۔ وہ بہت کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ ادب کے نئے خانے میں جدید ترین بچھو ہے اور اردو طنز کی لغات میں حرفِ اوّل ہے اور (فی الحال) شاید حرفِ آخر بھی!

(پروفیسر) ادم پرکاش موہن

جنگ کی برکتیں

احباب مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں۔ کہ میں جنگ کو مصیبت کی بجائے رحمت کیوں سمجھتا ہوں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ پچھلے دنوں میں نے خوب ہاتھ رنگے ہیں۔ چور بازار میں یا قحط زدہ علاقہ میں چاول کی فروخت سے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ مالتھس (MALTHUS) کی طرح میں جنگ کے وجود کو بڑھتی ہوئی آبادی کے حق میں رحمتِ باری خیال کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ عرض ہے۔ کہ دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ روپیہ میں نے ضرور کمایا ہے۔ لیکن نہایت غیر مشکوک طریقہ سے۔ جنگ کے شروع ہونے کے فوراً بعد میں نے بھانپ لیا تھا۔ کہ جنگ کے دنوں میں زندہ رہنے کا راز اس نکتہ میں مضمر ہے۔ کہ چیزیں خریدنے کی بجائے چیزیں فروخت کی جائیں۔ چنانچہ پچھلے

دنوں میں نے قریب قریب گھر کی ہر ایک چیز فروخت کر دی۔ اگر آپ کبھی غریب خانے پر تشریف لائیں تو آپ کو ایک بوسیدہ دری۔ چند ضروری برتنوں اور دو ایک چارپائیوں کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آئے گی۔ آپ پوچھیں گے۔ "وہ صوفا سیٹ میزیں۔ کرسیاں۔ پلنگ اور فانوس کیا ہوئے۔ میں عرض کروں گا۔" وہ میں نے مدت ہوئی۔ اونے پونے نہیں بلکہ بہت اچھے منافع پر فروخت کر دیئے" مثلاً میرے پاس ایک ٹوٹا پھوٹا جاپانی گراموفون تھا۔ جو میں نے ۔ داشتہ آید بکار کے مصداق الماری میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کا بھونپو میں کبھی کبھی بیوی کو خواب سے بیدار کرنے کے لئے بجایا کرتا تھا۔ پرسوں میں نے اسے پچھتر روپے میں ایک گراموفون سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پچیس میں لیا تھا۔ پندرہ سال استعمال کیا۔ اور پچاس روپے نفع کمایا۔ تین ٹانگوں والی کرسی میں نے پندرہ روپے میں فروخت کی۔ اور ریسٹ واچ جو گنتی کے چند پرزوں پر مشتمل تھی۔ تئیس روپے میں۔ اور کتابیں! اب میری لائبریری تقریباً خالی ہو چکی ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو لغت کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں۔ سنا ہے یہ لغات آج کل نایاب ہے۔ اسے بھی عنقریب دگنی تگنی قیمت پر بیچنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

جنگ نے مجھے ضرورت سے زیادہ موقع شناس بنا دیا ہے۔ جب دیکھتا ہوں۔ کہ لوگوں کو گرم کپڑا نہیں ملتا۔ تو فوراً اپنا گرم کوٹ نیلام گھر بھیج دیتا ہوں۔ جب بازار سے سائیکلیں عنقا ہو جاتی ہیں۔ تو اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پالش کرا کے فروخت کر دیتا ہوں۔ پرسوں میں نے اخبار میں اپنے پارکر قلم کی فروخت کا اشتہار دیا۔ آج صبح کی ڈاک سے مجھے تین سو حضرات کے خطوط موصول ہوئے۔ حیرانی

ہوتی ہے۔ کہ لوگ اس قلم کو لے کر کیا کریں گے۔ نب گھس چکی ہے۔ پالش اُتر گیا ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود خریدار اِسے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ دو ایک نے تو لکھا ہے۔ کہ اگر انہیں یہ قلم نہ ملا تو شاید عالم مایوسی میں خودکشی کرلیں۔

جنگ کی وجہ سے مجھے چند ایسی مصیبتوں سے رہائی ملی ہے۔ جو بلا کے پیسے دردماں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ چمٹی رہتی تھیں۔ مثلاً بیوی کے تقاضے، مہمان۔ چھوٹے چھوٹے بے معنی اخراجات۔ امن کے زمانہ میں بیوی کے تقاضوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ "ساڑھی چاہیئے۔" "پاؤڈر ختم ہوگیا۔" "کنگھی ٹوٹ گئی۔" "صابن درکار ہے۔" "اچھا سا شیشہ لا دیجئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ اب جونہی بیوی نے کسی چیز کی فرمائش کی۔ میں نے جھٹ کوئی عذر پیش کر دیا۔ "کیا کہا آپ نے؟ پاؤڈر چاہیئے۔ لیکن جانِ من ولائیتی پاؤڈر تو کبھی کا عنقا ہو گیا۔ دیسی البتہ ملتا ہے۔ لیکن اس کے لگانے سے چہرے کی جلد پھٹ جاتی ہے۔ کہو تو لا دوں"۔ اور بیوی لمبا سا منہ بنا کر کہتی ہے۔ "بھاڑ میں جائے ایسا پاؤڈر۔" "ساڑھی چاہیئے؟" "لیکن جارجٹ یا کریپ کی ساڑھی آج کل کہاں! وائیل سے ذلیل ساڑھی ڈیڑھ دو سو میں آتی ہے۔" اور بیوی مایوس ہو کر بڑبڑاتی ہے۔ "نہ جانے یہ موئی جنگ کب ختم ہوگی۔ جارجٹ کے لئے جی ترس گیا۔"

جنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے۔ کہ آئے دن کے مہمانوں سے چھٹکارا ملا۔ جنگ سے پہلے میرا مکان اچھی خاصی کاروان سرائے تھی۔ جہاں مہمانوں کے قافلے ناگہانی حادثوں کی طرح نازل ہوتے تھے۔ اب جب سے گھور اک کا راشن ہوا ہے۔ اوّل تو کوئی میرے گھر کا رُخ نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی ٹپکتا ہے۔ تو ایک دفعہ

آنے کے بعد دوبارہ آنے کا نام نہیں لیتا۔ علی الصبح میں اُسے دودھ اور چینی کے بغیر چائے پیش کرتا ہوں۔ دو چار گھونٹ زہر مار کرنے کے بعد وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں "صاحب کیا کریں، جنگ کا زمانہ ہے۔ نہ چینی ملتی ہے نہ دودھ" دوپہر کے کھانے میں اُسے کچھ لطف نہیں آتا۔ جونہی وہ منہ میں پہلا لقمہ ڈالتا ہے۔ ایک آدھ کنکر اُس کی داڑھ سے ٹکرا کر ساری تیتیسی میں کپکپی سی پیدا کرتا ہے۔ اور وہ بلبلا کر کہتا ہے۔ "کیسی گندم ہے یہ" میں مُسکرا کر جواب دیتا ہوں یہ "راشن کی گندم ہے۔ دو سال سے یہی کھا رہے ہیں۔"

جنگ کی ایک برکت یہ بھی ہے۔ کہ ایامِ جنگ میں امن کے زمانہ کی نسبت شان وضعداری قائم رکھنا کہیں سہل ہے۔ جنگ سے پہلے محض نمائش پہ زرِ کثیر صرف کرنا پڑتا تھا۔ اب جنگ کی عنایت سے کسی قسم کی نمائش کی ضرورت نہیں۔ پہلے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر کہیں جاتا تھا۔ تو لوگ نظر انداز کر دیتے تھے۔ اب فلالین کی پتلون پہن کر (گو جس میں تین پیوند لگے ہوئے ہیں) کسی محفل میں شریک ہوتا ہوں تو اُسے دیکھ کر احباب کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ "اخاہ فلالین کیسے ہاتھ لگی؟" اور میں مُنہ چھپا کر کہتا ہوں "میرے ماموں کے داماد کے بہنوئی کا سالا محکمہ سول سپلائی میں ملازم ہے۔ اس کی وساطت سے دستیاب ہوئی" جنگ سے پہلے ہر روز داڑھی مونڈنا فیشن میں داخل تھا۔ اب داڑھی مونڈے ہفتے گزر جاتے ہیں لیکن کوئی دوست اس کوتاہی کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ہر ایک جانتا ہے۔ کہ جب اچھے بلیڈ نہیں ملتے، تو داڑھی مونڈنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ امن کے زمانے میں جب کبھی بناسپتی گھی کا ڈبہ خریدتا۔ تو راہگیروں کی آنکھ بچا کر ایسے چلتا۔ گویا یہ گھی نہیں۔ بلکہ میری "منجمد کمینگی" ہے

اب بناسپتی گھی کا کنستر نہایت طمطراق سے گھر میں لاتا ہوں۔ شام کے جھٹپٹے میں نہیں روز روشن میں۔ اور دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں داب لیتے ہیں "بناسپتی گھی کا کنستر! ضرور رکھیں واقفیت ہوگی"۔

اسے بھی جنگ کی عنایت سمجھیے۔ کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے اخراجات سے نجات ملی۔ راہ چلتے کوئی فقیر پیسے کے لئے درخواست کرتا ہے۔ تو فوراً دھتکارتا ہوں"۔ جانتا نہیں آجکل ریز گاری نہیں ملتی۔ پیسہ پیسہ چلا ۔ ہا ہے"۔ کوئی سادھو آٹا مانگنے آتا ہے۔ تو لال لال آنکھیں دکھا کر کہتا ہوں "معاف کرو بابا۔ آٹا راشن ہو چکا ہے"۔ ایڈیٹر مضمون لکھنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو انہیں کہلا بھیجتا ہوں"۔ نہ سیاہی ہے نہ قلم نہ کاغذ۔ مضمون خاک لکھوں"۔ کوئی پیغام محبت بھیجتا ہے۔ تو اسے فہمائش کرتا ہوں"۔ صاحب جنگ کا زمانہ ہے۔ لبوں کے لئے سرخی ملتی ہے۔ نہ آنکھ کے لئے کاجل۔ مصوری اس لئے نہیں سیکھ سکتا۔ کہ تمام مصور محکمہ پراپیگنڈا میں چلے گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ بہر ملاقات کوئی بھی تو تقریب نہیں۔ کچھ دن اور صبر کیجئے۔ شاید جنگ کے بعد کوئی سبیل نکل آئے"۔

الغرض جنگ کی برکتوں کو کہاں تک گنواؤں۔ دفتر چاہیئے۔ اور جنگ کے دنوں میں دفتر تو ہزاروں کھل گئے ہیں۔ لیکن کاغذ پر ابھی تک کنٹرول ہے۔

واقفیت

چند دن ہوئے ایک بزرگ گاؤں سے تشریف لائے۔ کہنے لگے "خان اکرم باز خان سب انسپکٹر فلاں پولیس سٹیشن کو جانتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں"۔ "حوالدار ریلوا رسنگھ سے تعارف ہے؟" "نہیں"۔ "شام لال سپاہی کو پہچانتے ہو؟" "نہیں" جھلا کر فرمانے لگے "بیڑا غرق!" میں نے پوچھا "کس کا؟" فرمایا "میرا، تمہارا اور اختر کا"۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "بات کیا ہے؟" انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا "اختر کی عادات سے تم بخوبی واقف ہو۔ آئے دن جھگڑا مول لینا اس کا خاصہ ہے۔ پرسوں

اپنے سپرنٹنڈنٹ پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ میں نے سوچا تمہاری پولیس والوں سے راہ و رسم ہوگی اور مل کر معاملہ رفع دفع ہو جائے گا لیکن تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی"۔ میں نے متانت سے کہا۔" لاہور میں صرف دو آدمیوں کو جانتا ہوں۔ ایک ہے ماتا دین پنواڑی اور دوسرا چپڑاسی لال دھوبی"۔ انہوں نے ایک بار پھر زور سے کہا۔ " بیڑا غرق" اور تشریف لے گئے۔ تین ہفتوں کے بعد پھر میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔" ہیرا لال سب جج کو جانتے ہو؟" "نہیں"۔ "موتی لال ریڈر سے جان پہچان ہے؟" "نہیں"۔ "چاندی رام چپڑاسی سے سفارش کر سکتے ہو؟" "نہیں"۔ طیش میں آ کر انہوں نے اپنا تکیہ کلام دہرایا اور چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی محدود جان پہچان پر واقعی تعجب ہوا۔ میں نے سوچا۔ آج تو اختر کا معاملہ ہے۔ کل اگر اپنے آپ پر مصیبت بن جائے تو۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ واقفیت کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ میرے محلے میں ایک سب جج رہتے ہیں۔ میں نے کہا چلو واقفیت کی بسم اللہ ان سے ہی کی جائے۔ ایک اتوار کی صبح کو ان کی کوٹھی پہ حاضر ہوا۔ کارڈ بھیجا۔ ویٹنگ روم میں جہاں بہت سے ملاقاتی تشریف فرما تھے۔ بٹھایا گیا۔ اخبارات کی ورق گردانی کی۔ جمائیاں لیں۔ ایک پیکٹ سگریٹوں کا ختم کیا۔ دربان کی منت سماجت کی۔ آخر جب سب ملاقاتی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ تو میری باری آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آداب بجا لایا۔ سب جج صاحب نے عینک اتاری۔ ایک سیکنڈ کے لئے میری طرف دیکھا۔ عینک لگا لی۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر عینک اتاری اور فرمایا۔ "کہئے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "فرمائیے"۔
"کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی۔"

چند لمحے ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ یک لخت مجھے خیال آیا۔ کہ اب موضوع بدلنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"بہت گرمی پڑ رہی ہے"۔

"ہوں۔"

"لاہور کی گرمی سے خدا بچائے۔"

"ہوں۔"

"لیکن جناب لاہور کی سردی تو گرمی سے بھی زیادہ اذیت بخش ہوتی ہے"۔

"ہوں۔"

"لاہور کی برسات کے کیا کہنے!"

انہوں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: "اب صرف موسمِ خزاں رہ گیا۔ اس کے متعلق بھی کچھ کہہ ڈالیے۔"

میں نے عاجزی سے کہا۔ "بندہ پرور! موسم بہار کو تو آپ بھول ہی گئے۔"

چند سیکنڈ پھر خاموشی رہی۔ میں نے سوچا۔ اب پھر موضوع بدلنا چاہیئے۔

"آخر جنگ ختم ہو ہی گئی"۔

"جی ہاں"۔

"آخر ہٹلر مر ہی گیا"۔

"جی ہاں۔"

"آخر آسٹریلین ٹیم میچ جیت ہی گئی"۔

اُنہوں نے تنگ کر کہا "کام کی بات کیجئے" میں نے انکساری سے جواب دیا "اگر میری باتیں پسند نہیں۔ تو آپ ہی کوئی قصہ سنایئے"

"میں آپ کی طرح بیکار نہیں"

میں نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یوں کہیئے۔ آپ کو باتیں بنانی نہیں آتیں"

انہوں نے جھنجھلا کر فرمایا "آپ کا مطلب ؟"

"کچھ نہیں" میں نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا "سنیئے میں آپ کو ایک نہایت دلچسپ بات سُناتا ہوں۔ ہمارے محلہ میں میرا مطلب ہے جس محلہ میں آپ بھی رہتے ہیں۔ مانا دین نیواڑی کی دکان ہے۔ اُس کے پاس ایک بکری ہے۔ جس کی پانچ ٹانگیں ہیں۔ آپ نے شاید وہ بکری نہیں دیکھی۔ سُنا ہے۔ یہ بکری تین سیر دُودھ۔

"معاف کیجئے میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں۔ آپ تشریف لے جایئے"

"ضرور ضرور لیکن گاہے گاہے ملا کیجئے۔ میرا مکان نزدیک ہی ہے۔ مانا دین نیواڑی سے پُوچھ لیجئے گا"

اُنہوں نے زیرِ لب کچھ کہا۔ میں نادم سا ہو کر کمرے سے باہر چلا آیا۔

سب جج صاحب کے ہاں دال گلتی نہ دیکھ کر میں نے پولیس سٹیشن کا رُخ کیا۔ سوچا پولیس والے بڑے کام کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان سے ہی دبستی گانٹھی جائے۔ پولیس سٹیشن کے قریب پہنچا۔ دیکھا کہ ایک سپاہی بندوق اُٹھائے پہرہ دے رہا ہے۔ دو سپاہی ایک ملزم کی مرمت کر رہے ہیں۔ اور ایک حوالدار ایک سفنے کو گالیاں دے رہا ہے۔ دفتر میں

داخل ہُوا۔ ہیڈ کلرک کو سلام کیا۔ اُنہوں نے پتھر کھینچ مارا۔" آپ کون ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں۔" عرض کیا۔ انسپکٹر صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ پوچھا۔" آپ کا نام؟" نام بتایا۔ پھر پوچھا" باپ کا نام۔ ذات۔ پیشہ۔ سکونت۔" مَیں نے کہا تفاصیل میں مت جائیے۔ مَیں صرف دو چار منٹ کے لئے انسپکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہُوا۔ کہ انسپکٹر صاحب چند معزز شہریوں سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لئے آدھ گھنٹہ سے پہلے نہیں مل سکتے۔" دفتر میں بیٹھ گیا۔ اور اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ بائیں دیوار پر بارہ بیس ہتھکڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دائیں دیوار پر تختہ سیاہ پر حوالات میں قیدیوں کی تعداد لکھی ہوئی تھی۔ سامنے کی دیوار پر اُن لوگوں کی تصویریں فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ جو مختلف جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد روپوش ہیں۔ اور جن کی گرفتاری کے لئے گورنمنٹ نے انعامات مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک بات رہ رہ کر میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ ان میں سے بہتوں کا حلیہ مجھ سے ملتا تھا۔ مَیں سوچنے لگا کہ اگر انسپکٹر صاحب کو شک پڑ گیا تو۔ اتنے میں ہیڈ کلرک نے کہا۔" اب آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

انسپکٹر صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ اور گفتگو کا آغاز اِس فقرہ سے کیا۔

"انسپکٹر صاحب۔ آپ کا بھی عجیب پیشہ ہے۔ ہمیشہ چوروں اور بدمعاشوں سے پالا پڑتا ہے۔"

وہ کچھ ناراض سے ہو گئے اور کہنے لگے۔" ہمیشہ نہیں۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے مَیں چند نہایت معزز لوگوں سے بات چیت کر رہا تھا۔"

مَیں نے آہستہ سے کہا۔" مَیں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوں۔ محکمہ تعلیم شریف ترین محکمہ ہے۔"

"آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟"

"انسپکٹر صاحب میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ میرا کوئی دوست ہنسی مذاق میں میرا مطالب ہے غصہ کی حالت میں کسی کو قتل کر بیٹھے۔ تو آپ اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے"۔

"مَیں اُسے زیر دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند گرفتار کر لوں گا"۔

دیکھئے انسپکٹر صاحب۔ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے۔ کم از کم اس بات کا لحاظ کیجئے گا کہ وہ میرا دوست ہے۔ مَیں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوں اور محکمہ تعلیم شریف ترین"......

"فرض، فرض ہے" انہوں نے گرج کر فرمایا۔

"سنئے۔ انسپکٹر صاحب۔ وعدہ کیجئے کہ آپ اُسے کچھ نہیں کہیں گے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ پرنسپل صاحب سے سفارش کر کے آپ کے لڑکے کی آدھی فیس معاف کرا دوں گا"۔

"مجھے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ قاتل کون ہے۔ اس وقت کہاں ہے اور جرم کس جگہ سرزد ہوا"۔

"انسپکٹر صاحب۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ واللہ۔ میں تو ناکردہ جرائم کا ذکر کر رہا ہوں۔ اور آپ ملازم کو پھانسی پر لٹکوانے کے خواب دیکھ رہے ہیں"۔

"اگر یہ بات ہے۔ تو آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں"۔

"اچھا سنئے۔ مَیں کوشش کر کے ساری فیس معاف کرا دوں گا۔ کہئے یہ سودا منظور ہے"۔

"فضول باتیں نہ بنایئے۔ اور پولیس سٹیشن سے فوراً باہر چلے جایئے"۔

پولیس سٹیشن سے واپس گھر آ رہا تھا۔ رستے میں پاگل خانہ پڑتا تھا میں نے خیال کیا چلو پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ہی واقفیت پیدا کی جائے۔ کیا معلوم کوئی دوست کسی وقت پاگل ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ملاقات کی۔ ابھی میں حرفِ مطلب زبان پر لایا ہی تھا۔ کہ ایک ملازم نے آکر کہا: "جناب نمبر پچیس تین گھنٹے سے چلّا رہا ہے۔ میں پان کا پتّہ ہوں۔ کیا کیا جائے"۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بآوازِ بلند فرمایا: "اُس حرامی کو کوڑے لگاؤ۔ درست ہو جائے گا"۔ اتنے میں ایک اور ملازم یہ سندیسہ لایا: "حضور نمبر تینتیس نے سلاخوں کے ساتھ سر پٹخ پٹخ کر اپنے آپ کو لہولہان کر لیا ہے"۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فرمایا: "اُس کی مشکیں اور کس دو اور ہسپتال میں پہنچا دو"۔

یہ حکم صادر کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے۔ "آپ کیسے تشریف لائے۔ کسی عزیز سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا: "میں آپ سے ملنے آیا ہوں"۔

"فرمائیے"۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب اگر میرا کوئی ادیب دوست پاگل ہو جائے اور پکارنا شروع کر دے۔ میں پریم چند ہوں۔ میں ٹیگور ہوں۔ میں کالی داس ہوں۔ تو آپ اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے"۔

"میں اُسے پیار سے سمجھاؤں گا۔ کہ عزیز تم پریم چند نہیں دنی چند ہو"۔

"اگر وہ نہ مانے"۔

"تو میں اُسے کوڑے لگاؤں گا"۔

"ایسا غضب نہ کیجئے گا سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ ادیب تو پہلے ہی ادھ موئے ہوتے ہیں۔"

"آپ کو شاید علم نہیں کہ پاگل آدمی صرف چابک سے ڈرتا ہے"۔

"کیا آپ یہ نہیں کرسکتے کہ اُسے شمس العلما یا مہامہو اُپادھیائے کا خطاب دلا دیں"۔

"آپ عجیب باتیں کرتے ہیں"۔

"مَیں عجیب باتیں کرتا ہوں یا آپ۔ ذرا کسی سے پُوچھئے تو"۔

"کس سے پُوچھوں؟ یہاں سب پاگل رہتے ہیں"۔

"پاگل لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب شیکسپیئر نے کہا ہے۔ عشاق، شاعر اور پاگل ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں"۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"ہُوں۔ ذرا میرے قریب آیئے۔ اور مجھے اپنی آنکھوں میں ایک منٹ کیلئے جھانکنے دیجیئے"۔

مَیں نے کہا۔ "اجی میں کس لائق ہوں۔ اگر آپ کو واقعی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی حرص ہے۔ تو کسی بہتر شخص سے آنکھیں لڑایئے"۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب پینترا بدل کر کہنے لگے۔ "آپ کا شغل؟"

"معلم ہوں"۔

"کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں؟"

"بارہ گھنٹے"۔

"دودھ پیتے ہیں؟"

"کبھی کبھی"۔

"نیند کا کیا حال ہے؟"

جس دن پانچ پیریڈ (PERIOD) پڑھاؤں۔ نیند نہیں آتی"۔

"ہُم۔ مجھے پہلے ہی شک تھا"۔

یہ کہکر اُنہوں نے زور سے گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم بھاگا ہوا آیا۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ "انہیں پہچانتے ہو"۔

میرا اقبال ہے"۔ "یہ وہی شخص ہیں جو گذشتہ سال کمرہ نمبر چالیس سے بھاگے تھے"۔

ملازم نے غور سے مجھے دیکھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ میں چالیس نمبر سے ملتا جُلتا ضرور ہوں۔ لیکن چالیس نمبر نہیں ہوں"۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ "آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ دیکھئے کام کی مقدار ذرا کم کر دیجئے گا"۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے ایک لحظہ کے لئے میں ماتا دین پنواڑی کی دُکان پہ رُکا۔ ماتا دین نے کہا۔

"کہیئے کیا حال ہے؟"

"آپ کی دُعا ہے۔ بکری کا کیا حال ہے؟"

"اجی صاحب۔ بکری تو کمال کر رہی ہے۔ اب سوا تین سیر دودھ دیتی ہے"۔

"واقعی"۔

"ہاں صاحب۔ لیکن آج آپ کی آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں"۔

"دھوپ میں چلتا رہا ہوں"۔

"نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ آپ کا جگر بڑھ گیا ہے۔ بکری کا دودھ پیا کیجیے گا۔ کہو تو بھجوا دوں"۔

"ضرور۔ ضرور"

"ہاں صاحب صحت کا ضرور خیال رکھا کیجیے گا۔ صحت نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔

نٹ راج

کیلاش پربت پر بیٹھے ہوئے نٹ راج نے پاربتی سے کہا "میں نرتا کا دیوتا ہوں مجھے خاموشی اور سکون سے نفرت ہے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی بجائے مجھے چیخ و پکار اور نالہ و شیون میں زیادہ لطف آتا ہے مسلسل جمود سے میری طبیعت گھبرا سی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ زلزلے۔ طوفان، چیخیں۔ غلغلے اور پھر پچھلے پچیس سال سے دنیا میں کوئی دھماکہ بھی تو نہیں ہوا"۔

پیشتر اس کے کہ پاربتی نٹ راج کی بات سمجھ سکتی اس نے اٹھ کر تانڈو ناچ شروع کر دیا۔ یک لخت اس کی آنکھوں میں شعلے لپکے۔ جٹاؤں میں گُتھے ہوئے سانپ پھنکارنے لگے۔ گلے میں لٹکی ہوئی کھوپڑیوں نے خوفناک قہقہے لگائے۔

"دھم! دھم! دھم! دھما دھم! دھما دھم"!! نٹ راج ناچ رہا تھا "ہزاروں

پہاڑ مینناوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ ہزاروں بجلیاں آگ اور بارود کی صورت میں کوندیں۔ ہزاروں بادل ہوائی جہاز بن کر فضا میں منڈلائے۔ اور پولینڈ کی راجدھانی وارسا پر بموں کا مینہ برسنے لگا۔ لاکھوں لوگ بچے۔ عورتیں اور بوڑھے۔ بھاری بھرکم کروڑوں اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں، وزنی سلاخوں اور پتھروں کے نیچے سسک سسک کر دم توڑنے لگے سرد آہوں۔ فلک شگاف چیخوں اور مغموم التجاؤں کے قافلے کیلاش پربت کو چھوتے ہوئے برف کے تودوں میں بھٹک گئے۔ نٹ راج کے چہرہ پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اور تیزی سے ناچنا شروع کر دیا۔

"دھم۔ دھم۔ دھما دھم۔" پاربتی نے کیلاش پربت سے جھانک کر دیکھا۔ فرانس کے خوبصورت شہروں پر اولوں کی طرح بم برس رہے تھے۔ چشم زدن میں فرانس کا حسن فرانس کا آرٹ۔ فرانس کے نغمے ملبوں کے ڈھیروں اور بارود کے شعلوں کی نذر ہو گئے۔ اگلے لمحے میں پاربتی نے دنیا کے سب سے بڑے شہر لندن کو جلتے ہوئے دیکھا۔ آگ کے شعلے کیلاش پربت کی طرف لپک رہے تھے۔ پاربتی کو یوں محسوس ہوا جیسے مغربی تہذیب نے خودکشی کرنے کے لئے لندن کے سطح میں بڑی بھاری چتا روشن کی ہے۔ حدِ نظر تک آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی انسانوں کے سر بازو۔ ٹانگیں اور دھڑ ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے۔ دھواں گہرا ہو رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس دھوئیں کو بموں کی خوفناک آوازوں۔ مشین گنوں کے دھڑ دھڑاتے ہوئے گولوں۔ انسانوں کی روح فرسا چیخوں نے اتنا بوجھل بنا دیا۔ کہ پاربتی کا دم گھٹنے لگا۔

"بند کرو نٹ راج! بند کرو! یہ خوفناک ناچ" پاربتی نے چلا کر کہا۔

"ہاہاہا..... ہاہاہا..... " نٹ راج نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ اور پہلے سے بھی

زیادہ جوش کے ساتھ ناچنے لگا۔ بارود کالا واحشکی اور تیزی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ نٹ راج کی جٹاؤں سے خون ٹپکنے لگا صحراؤں کی ریت خون سے بھیگ کر لال ہوگئی۔ سمندروں میں خون کے طوفان اٹھے۔ چاروں طرف آگ ہی آگ۔ دھواں ہی دھواں اور خون ہی خون نظر آنے لگا۔

"شنکر!" پاربتی نے ایک دفعہ اور چیخ کر کہا "ناچ بند کرو"۔

نٹ راج ایک لمحہ کے لئے رُکا۔ اُس نے بھویں تنے ہوئے پاربتی کو مخاطب کیا۔

"پاربتی! تم نہیں جانتیں کہ دنیا کو تباہی کی کتنی ضرورت ہے۔ ادھر چند سالوں سے برہمانے ہزاروں نااہل، بے سمجھ اور بے مصرف آدمی پیدا کر دیئے ہیں اگر دنیا کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی۔ تو بیچارہ وشنو جس کے کندھوں پر برہما کی مخلوق کی پرورش کی ذمہ داری ہے۔ عجیب مخمصے میں پڑ جائے گا"۔

"دھم دھما دھم۔ دھم دھما دھم"۔ نٹ راج نے پھر ناچنا شروع کر دیا لینن گراڈ۔ ماسکو۔ سٹالن گراڈ۔ طبروق۔ مالٹا۔ سنگاپور۔ مانڈلے اور رنگون میں حشر سا بپا ہوا گرجوں مندروں اور پیگوڈوں کے کلس ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر آرہے۔ پل۔ ریلوے لائنیں اور کارخانے ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اُچھلے۔ پاربتی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نٹ راج کا ناچ اپنے شباب پر تھا زمین کانپ رہی تھی انسان گھبرایا اور سہما ہوا انسان شنکر کا واسطہ دیکر پکار رہا تھا۔ "ہے شو شنکر! نیل کنٹھ ہے تربوکی کے ناتھ۔ دیا کرو دیا کرو"۔ لیکن نٹ راج اپنے ناچ میں اتنا منہمک تھا کہ یہ آوازیں صدا الصحرا بن کر رہ گئیں۔ نٹ راج کا ناچ دلکش سے دلکش تر ہوتا گیا۔ اور زمین پر رہنے والوں پر سخت سے سخت تر آفتیں اور بلائیں نازل ہوتی گئیں۔ گرانی۔ راشن سسٹم۔ بھوک۔ قحط اور زمین سے آہ و فریاد کا غلغلہ اُٹھا۔

"میرا اکلوتا بیٹا!"

"میرا لال!"

"میری عصمت مٹھی بھر چاولوں کے عوض خریدی گئی۔"

"لوگو میں لٹ گئی۔ میرا بچہ سسک سسک کر مرگیا!"

پاربتی نے یہ آہ و زاریں سنیں۔ اُس کی آنکھیں غمناک ہوگئیں۔ نٹ راج نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ سہمی ہوئی مخلوق اور سہم گئی۔

معصوم حسین دوشیزاؤں کی عصمتیں لُٹیں۔

لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شعلوں کی نذر ہوئیں۔

بوڑھے اور بچے بیدردی سے قتل کئے گئے۔

پاربتی سے نہ رہا گیا۔ اُس نے نٹ راج سے آخری بار ناچ بند کرنے کی درخواست کی۔ نٹ راج کی وارفتگی اب جنون کی حد کو پہنچ چکی تھی۔ وہ ناچ میں نئی نئی جدتیں پیدا کر رہا تھا۔ پاربتی کو محسوس ہُوا کہ اگر تانڈو چند منٹ اور جاری رہا۔ تو دُنیا ختم ہو جائے گی۔ وہ اٹھی۔ اور نٹ راج کو خوش کرنے کے لئے اُس کی آرتی اُتارنی شروع کی۔" دھن دھن مہادیو۔ جے جے مہادیو۔ دھن دھن مہادیو....."

نٹ راج نے مسرت سے چلّا کر کہا۔" نہیں پاربتی، یہ ناچ بند نہیں ہو سکتا۔ جب تک انسان زندہ رہے گا۔ جب تک وہ آگ اور بارود کے شعلوں سے کھیلتا رہیگا۔ جب تک اُسے زر اور زمین کی ہوس رہیگی۔ جب تک وہ انسانی خون کی قدر نہیں کرے گا۔ یہ ناچ جاری رہے گا۔ ہاہاہا... میں نسلِ انسانی کو ختم کرکے دم لوں گا۔ یہ خون کی پیاسی نسل۔ یہ بھیڑیوں اور چیتوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹنے والی نسل۔ میں اسے آگ

کے شعلوں میں بھسم کر دوں گا۔ اور اس کی راکھ سے ایک نئی نسل کی تخلیق کروں گا۔ ایک نئی نسل جو شاید ہوائی جہاز اور بمبار نہ بنا سکے لیکن جو اس زخمی اور جھلسی ہوئی زمین پر ایک نئے بہشت کی بنیاد رکھ سکے"۔

پاربتی نے نٹ راج کی بات کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر نٹ راج کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور دوسرے لمحے میں اس نے نٹ راج کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک پُر اسرار اور سحر آفریں مسکراہٹ اس کی طرف پھینکی اور کہا "میرے بھولے مہا دیو! تم واقعی بہت بھولے ہو۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ صرف انسان ہی وہ جانور ہے۔ جو تجربہ سے کبھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار تم اسکی خصلت بدلنے کی ناکام کوشش کر چکے ہو۔ لیکن نتیجہ؟ چھوڑو یہ بے سود باتیں۔ یہ جانور کبھی سدھر نہیں سکتا۔ یہ جانور کبھی نہیں سدھرے گا ..... آؤ! کیلاش پربت پر چاند اور ستاروں کو آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیکھیں"۔

پریس کانفرنس

افراد:۔ حضور لیڈر۔

حضور لیڈر کا پرائیویٹ سیکرٹری

اخباری نمائندے۔

مقام:۔ حضور لیڈر کی کوٹھی

پرائیویٹ سیکرٹری (اخباری نمائندوں سے) آپ لوگ آگئے۔ شکریہ آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں۔ حضور لیڈر امریکہ کی ایک مشہور انشورنس کمپنی کے ایجنٹ سے بات چیت کر رہے ہیں۔

ایک نمائندہ:۔ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ سے؟

سیکرٹری۔ جی ہاں۔ لیکن یہ مت پوچھئے کس موضوع پر!

دوسرا نمائندہ۔ کیا میں آپ سے درخواست کرسکتا ہوں کہ حضور لیڈر کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے آپ اُن کے سیاسی پروگرام پر روشنی ڈالیں۔

سیکرٹری۔ میں انکے سیاسی پروگرام کے متعلق زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اتنا ضرور کہونگا کہ حضور لیڈر نہایت مصروف آدمی ہیں۔ ہر روز تقریباً ایک درجن بیانات اخبارات کو دیتے ہیں۔ ایک درجن بیانات کی تردید کرتے ہیں۔ ان دِنوں حضور وائسرائے سے خط وکتابت کر رہے ہیں اور عنقریب وزیر ہند سے ملنے کے لئے لنڈن جا رہے ہیں۔

ایک نمائندہ۔ اچھا تو حضور لیڈر لنڈن بھی جا رہے ہیں؟ کب؟

سیکرٹری۔ وقت آنے پر اس امر کا اعلان اخبارات میں کر دیا جائے گا..... اچھا یہ لیجئے حضور لیڈر کی فوٹو کی کاپیاں انہیں آپ اخبارات میں چھاپ سکتے ہیں۔ اس بات کا ذرا خیال رکھئے گا کہ فوٹو اخبار کے پہلے صفحہ پر ہو۔ ایک اور درخواست آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ کانفرنس کے دوران میں کوئی شخص حضور لیڈر سے پریشان کُن سوالات نہ کرے۔

لیڈر۔ آپ کا مطلب؟

سیکرٹری۔ میرا مطلب ہے اس قسم کے سوال کہ "آپ نے سیاسیات کی باقاعدہ تعلیم کہاں حاصل کی؟" "آپ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی مسٹر چرچل اور جوزف سٹالن سے کیوں افضل سمجھتے ہیں۔" "آپ جیل جانے سے کیوں ڈرتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایک نمائندہ۔ کیا ہم اُن کے بیان پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں؟

سیکرٹری۔ میرے خیال میں نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضور لیڈر نکتہ چینی سے

بہت گھبراتے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک اخبار نے اُن کا ایک کارٹون چھاپا۔
جس میں اُن کے چہرے کو اُلّو سے مشابہت دی گئی تھی۔ حضور لیڈر اس
کارٹون کو دیکھ کر اتنے تلملائے کہ انہوں نے اُس اخبار کے نمائندہ کو پچھلی پریس
کانفرنس سے کان پکڑ کر باہر نکال دیا۔

ایک نمائندہ۔ کیا حضور لیڈر اتنے زود رنج واقع ہوئے ہیں؟

سیکرٹری۔ زود رنج نہیں بلکہ حساس۔ بلکہ یوں کہئے..... لیجئے وہ تشریف
لا رہے ہیں۔

(تمام نمائندے کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہیں)

حضور لیڈر۔ تشریف رکھیئے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔

ایک نمائندہ۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نہایت اہم گفتگو کر رہے
تھے۔

حضور لیڈر۔ جی ہاں نہایت اہم گفتگو۔ میرا خیال ہے اس گفتگو کے شائع
ہوتے ہی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ پچھلی نصف صدی میں اس سے زیادہ
اہم گفتگو شائع نہیں ہوئی۔

ایک نمائندہ۔ کیا میں پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس گفتگو کی نوعیت
کیا ہے؟

حضور لیڈر۔ یہ گفتگو ابھی صیغہ راز میں ہے۔ میں آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں بتا سکتا
کہ یہ نہایت اہم گفتگو ہے...... ہاں اور میں گذارش کروں گا کہ آپ
اس قسم کے سوال اگر مجھ سے نہ کریں تو اچھا رہے گا۔ میرا خیال ہے میرے

سیکرٹری نے آپ کو تمام ہدایات دے دی ہیں۔

سیکرٹری۔ جی ہاں۔ میں نے انہیں تمام باتیں سمجھا دی ہیں۔

ایک نمائندہ کیا حضور لیڈر، اس اہم "گفتگو" کا انکشافات اگلی پریس کانفرنس میں کریں گے؟

حضور لیڈر۔ ہو سکتا ہے۔ شاید نہیں۔ ہاں لیکن ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خیر تو جس مطلب کے لئے آپ لوگوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ وہ ہے ہندو مسلم اتحاد کے متعلق میرا تازہ ترین فارمولہ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ لوگ اس فارمولہ کی نشر و اشاعت میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے ساتھ پورا تعاون کریں۔ کیونکہ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ مسئلہ سے زیادہ اہم فارمولہ ہے جسے میں نے دس برس کی متواتر دماغ سوزی کے بعد تیار کیا ہے (ماتھے سے پسینہ پونچھ کر) خدا بہتر جانتا ہے مجھے کس قدر کاوش کرنا پڑی۔ لیکن خالق دو جہاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ میری محنت سپھل ہوئی۔ اور میں اس پیچیدہ مسئلہ کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ جو بات مہاتما گاندھی کو نہ سوجھی۔ جس راز کو ابوالکلام آزاد نہ پا سکے۔ جس معمہ نے بڑے بڑے سیاست دانوں کو چکرا دیا۔ جس سوال نے ہر محب وطن کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ اس کا حل سوچنے میں یہ خاکسار کامیاب ہوا۔ سچ کہا ہے کسی نے ؎ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

ایک نمائندہ۔ حضور بجا فرماتے ہیں۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانا ہر ایک لیڈر کے بس کی بات نہیں۔

حضور لیڈر۔ لیڈر۔ ہندوستان میں لیڈر ہیں ہی کتنے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ہندوستان میں اتنے لیڈر بھی نہیں جتنے انگلستان میں ذہین آدمی۔ یاد رکھئے۔ کھدر پہننے یا چرخہ کاتنے سے انسان لیڈر نہیں بن سکتا۔ ہتھکڑی لگوانے سے "سی کلاس" مل سکتی ہے۔ لیڈری نہیں۔ لیڈری کا ملکہ خداداد ہے۔ لیڈر شاعروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جاتے۔ میری طرف دیکھئے۔ لیڈری میری گھٹی میں پڑی ہے۔ کالج میں سب سے زیادہ (STRIKES) سٹرائیکس میں نے کرائیں۔ کلب میں سب سے زیادہ جھوٹ میں بولتا ہوں۔ ایڈیٹر بجکر سب سے زیادہ چندہ میں نے ہضم کیا۔ حضرات! لیڈر بننے کے لئے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ صرف لیاقت سے کام چل جاتا ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔

ایک نمائندہ۔ آپ فرما رہے تھے کہ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک نیا فارمولا تیار کیا ہے۔

حضور لیڈر۔ ہاں۔ یہ فارمولا بالکل نیا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ آجتک کسی لیڈر کے ذہن میں نہیں آیا۔ اس فارمولے میں نکتہ یہ ہے کہ اسے ہندو اور مسلمان دونو پسند کریں گے۔ یہ فارمولا میرے تمام گذشتہ فارمولوں پر سبقت رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ سن اُنیس سو اکتالیس میں میں نے ایک فارمولا ایجاد کیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ کہ ہندو مسلم سوال کا بہترین حل یہ ہے کہ یا تو بیس کروڑ مسلمان دیگر ممالک سے ہندوستان میں لائے جائیں۔ یا بیس کروڑ ہندو ممالک غیر کو بھیجے جائیں۔ تاکہ ہندو مسلم تناسب پچاس پچاس فیصدی ہو جائے۔ لیکن یہ فارمولا

لوگوں نے لپ منہ رہ کیا۔ سن اُنیس سو چوالیس میں میں نے دُوسرا فارمولا تیار کیا۔ مَیں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان باری باری ہندوستان پر راج کریں مثلاً پہلے پانچ سال مسلمان سارے ہندوستان پر حکومت کریں۔ اِس کے بعد تخت سے پانچ سال کے لئے دست بردار ہو جائیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ لیکن یہ فارمولا بھی رد کر دیا گیا۔ اب سن اُنیس سو چھیالیس میں مَیں نے تیسرا فارمولا تیار کیا ہے۔ یہ فارمولا اس مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

ایک نمائندہ۔ قطع کلام معاف۔ لیکن اس فارمولا کی وضاحت فرما دیجئے۔

حضور لیڈر۔ مَیں اب وضاحت کی طرف آ رہا ہوں۔ مَیں سچ کہتا ہوں۔ یہ فارمولا اتنا دلآویز ہے کہ مجھے اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔ کئی بار جب مَیں اس فارمولے کی باریکیوں پر غور کرتا ہوں۔ تو مسرت سے چیخ اُٹھتا ہوں۔ مَیں واقعی بہت خوش نصیب ہوں۔ بات پھر بات میں کھو گئی۔ ہاں تو آپ لوگوں کو اس فارمولے کی وضاحت درکار ہے۔ اچھا تو سُنئے۔ میرے خیال میں ہندو مسلم اتحاد اِسلئے نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہندو اور مسلمان اتحاد نہیں چاہتے۔ مسلمان ہندوؤں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بدظن ہیں۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اگر ہندو راج قائم ہو گیا۔ تو اسلامی تہذیب اور تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ اگر حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی۔ تو ہندو تہذیب ملیامیٹ ہو جائے گی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔

ایک نمائندہ۔ تو گویا۔ آپ پاکستان کے حق میں ہیں؟

حضور لیڈر۔ آپ پہلے میری بات تو سُن لیجئے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی اسلام اور ہندو ازم دونوں خطرے میں ہیں۔

ایک نمائندہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

حضور لیڈر۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس امر کے باوجود ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک ہندو اخبار کا نمائندہ۔ تو گویا آپ اکھنڈ ہندوستان کے حق میں ہیں؟

حضور لیڈر۔ آپ مجھے پہلے بات تو ختم کر لینے دیجئے۔ ہاں تو میرے خیال میں ہندوستان کو ہندوستان ہی رہنے دیا جائے۔ پاکستان، خالصتان۔ اچھوتستان کی ضرورت نہیں۔

ایک نمائندہ۔ یہی تو مہاتما گاندھی کہتے ہیں۔

حضور لیڈر۔ ہاں مگر گاندھی جی کے فارمولے اور میرے فارمولے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مہاتما گاندھی اس بات کا کوئی حل پیش نہیں کر سکے کہ اگر اسلام خطرہ میں پڑ گیا۔ تو اس کا کون ذمہ دار ہوگا۔

ایک ہندو اخبار کا نمائندہ۔ مگر کیا واقعی اسلام خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

حضور لیڈر۔ کیوں نہیں۔ آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کیجئے۔ یقیناً آپ واقعات کو جھٹلا نہیں سکتے۔

ایک نمائندہ۔ اس طرح تو ہندو ازم بھی کئی بار خطرہ میں پڑ چکا ہے۔

حضور لیڈر۔ میں کب کہتا ہوں۔ کہ ہندو ازم ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ میں نے تو شروع میں اس بات کی توضیح کر دی ہے۔ کہ اسلام اور ہندو ازم دونوں کے خطرہ میں

پڑنے کے امکانات ہیں۔ یہی تو میرے فارمولے میں خوبی ہے۔ کہ وہ اس خطرہ سے بچنے کا خاطر خواہ طریقہ پیش کرتا ہے۔

ایک نمائندہ ۔ وہ طریقہ ہمیں بھی بتا دیجئے۔

حضور لیڈر ۔ دیکھئے حضرات۔ مہذب ممالک میں حفظ ماتقدم کے طور پہ ہر چیز کو خطرہ سے بچانے کے لئے اُس کا بیمہ کرایا جاتا ہے۔ انسانی زندگی، مکان کو آگ لگ جانے وغیرہ کا بیمہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ امریکہ میں کئی ایکٹرسوں نے اپنی آواز۔ اپنی سڈول ٹانگوں۔ اپنے خوبصورت ناخنوں کا بیمہ کرایا ہے۔ امریکہ واقعی عجیب مُلک ہے حضرات۔ وہاں ہر چیز کا بیمہ ہو سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک شخص نے اپنے طوطے کی چونچ کا بیمہ کرایا ہے۔

ایک نمائندہ ۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کا اس بات سے کیا تعلق ؟

حضور لیڈر ۔ ہندو مسلم اتحاد کا اس بات سے گہرا تعلق ہے۔ دیکھئے اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ تو اُنہیں چاہیئے کہ وہ اپنے اپنے مفاد کا بیمہ کسی امریکن کمپنی سے کرالیں۔ اس طرح وہ دونوں اُس خطرہ سے بچ جائیں گے۔ جو سانپ کے پھن کی طرح ہمیشہ اُن کے سروں پر لہراتا رہتا ہے اس کانفرنس میں آنے سے پہلے میں "کلچر انشورنس کمپنی" کے ایجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے یقین دلایا۔ کہ یہ کمپنی ہندو یا مسلم مفاد کا بیمہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ سالانہ پریمیم بھی کوئی زیادہ نہیں۔ یعنی صرف پچاس ہزار ڈالر۔ میرے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ پریمیم ادا کر سکیں تو حضرات یہ ہے میرا نیا فارمولا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے۔

آپ کا اس کے متعلق ؟

تمام تماشائی۔ (یک زبان) واقعی لائق قدر فارمولا ہے۔ ہم حضور لیڈر کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ حضور لیڈر زندہ باد۔

لیڈر۔ حضرات۔ آپ نعرے مت لگائیے۔ سوراج نعرے لگانے سے نہیں ملے گا۔ سوراج اس فارمولے پر عمل کرنے سے ہی مِل سکتا ہے۔ اِس لئے آپ سب کا فرض ہے۔ کہ آپ پہلی فرصت میں اس فارمولے کی اشاعت کا بندوبست کریں۔ اس پر لیڈنگ آرٹیکل لکھیں۔ اس کی کاپیاں چھاپ کر لوگوں میں مفت تقسیم کریں۔ یہ ہے اصلی خدمت !

تمام تماشائی۔ حضور بجا فرماتے ہیں۔

حضور لیڈر۔ خدا آپ کو توفیق دے۔ اور آپ صحیح معنوں میں قوم کے کام آسکیں۔ خدا حافظ۔

سیکرٹری۔ حضرات خیال رہے۔ کہ حضور لیڈر کی فوٹو صفحہ اوّل پر ہو۔

کہتے ہیں جس کو عشق............

"اِدھر اس نشست پر بیٹھیے پروفیسر صاحب۔ یہاں سے سارا شہر بخوبی نظر آتا ہے۔ لیجیے دُوربین۔ اسے سامنے والے مکان کی چھت کی طرف گھمائیے۔ اوہ، آپ جھجکتے ہیں! لائیے مجھے دیجیے۔ ابھی آپ کو وہ جلوہ نظر آئے گا۔ کہ اچھل پڑیں گے آپ' ذرا اپنی نگاہیں اس چھت پر گاڑے رکھیے بھئی اس چھت پر نہیں۔ اُس پہ وہ جو ہماری چھت سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ ایلو وہ آگئی۔ نہیں یہ تو خادمہ ہے۔ بُری نہیں یہ بھی لیکن نیلما! کیا بات ہے۔ نیلما کی! بوٹا سا قد۔ شفق سے ملتا جلتا رنگ۔ ستواں ناک۔ مُسکراتی ہوئی آنکھیں! آپ تیار رہیے۔ عنقریب آپ کو اپنی آنکھوں کی خیرگی کا احساس ہوگا۔ وہ دیکھیے۔ ارے نہیں۔ یہ تو نیلما کا کُتّا ہے۔ مجھے اس کُتّے سے بھی محبت ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے "مجھ سے محبت کرو میرے کُتّے سے محبت کرو"۔ کریں گے

صاحب ضرور کریں گے سہ پائے سگ یوسیا مجنوں .... دیکھئے دیکھئے وہ کوئی آیا۔ ذرا سامنے آجانِ تمنا۔ ارے یہ تو نیلما کی ماں ہے۔ غضب ڈھاتی ہوگی جوانی میں لیکن اب وہ پہلی سی بات کہاں۔ یہ بنگالی عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ لو وہ تن کر کرسی پر بیٹھ گئی بھئی یہ شگون اچھے نہیں۔ نیلما کی بجائے نیلما کی ماں خدا جانے محبوب کی ماں کے متعلق مجنوں کا کیا نظریہ تھا۔ ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتی یہ بنگالن۔ اگر اب بھی نیلما نہ آئی تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ ارے ارے نیلما تو گیراج کے باہر موٹر کے پاس کھڑی ہے کسی کے ساتھ جا رہی ہے شاید۔ باپ کے ساتھ۔ بھئی یہ زیادتی ہے۔ ذرا دوربین سنبھالنا پروفیسر صاحب میں اس چھت سے کود کر خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔ شکریہ!

"عجیب قصّہ ہے یہ بھی بعض اوقات خود مجھے تعجب ہونے لگتا ہے۔ آپ کبھی ٹنگمرگ گئے ہیں؟ نہیں گئے۔ خیر کوئی بات نہیں، پچھلے سال میں ٹنگمرگ کے سینے ٹوریم میں تھا۔ مجھے دق تھی۔ دق کا پہلا درجہ۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا۔ یک لخت میں زور سے کھانسا زنانہ وارڈ سے ایک لڑکی نے میری کھانسی کا جواب کھانسی سے دیا۔ چند ثانیوں کے بعد میں پھر کھانسا۔ اس کھانسی کا جواب پھر زنانہ وارڈ سے کھانسی ہی میں آیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بغیر ہماری آنکھیں لڑ گئی ہیں۔ تم کہو گے کھانسی لڑ گئی۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ رفتہ رفتہ وہ لڑکی میرے عشق میں گھلنے لگی۔ مردانہ اور زنانہ وارڈ کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ اسے پھاندنا میرے بس کی

بات نہ تھی۔ سوچا کسی رات زنانہ وارڈ کے عقب میں جا کر ان دیکھی محبوبہ سے بات چیت کروں۔ اگست کی ایک سیاہ اور ابر آلود رات کو مَیں زنانہ وارڈ کے عقب میں گیا۔ اُف کس قدر خوفناک رات تھی وہ۔ بادل کی کڑک، بجلی کی چمک اور جھاڑیوں میں پھنکارتے ہوئے زہریلے سانپ جونہی میرا پاؤں ایک جھاڑی پر پڑا۔ دو تین سانپ پھنکاریں مار کر میری طرف لپکے۔ مَیں اچھل کر کھڑکی کے ساتھ جا لگا۔ یقین کیجئے ہنسو نہیں۔ خوف کے عالم میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

"آشا" مَیں نے آہستہ سے کہا۔

کوئی جواب نہ آیا۔ "آشا" میں نے دہرایا۔ "میں ہوں شیام۔ تمہارا عاشق صادق۔"

یک لخت وہ اُٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس نے بے تحاشا کھانسنا شروع کر دیا۔

"آشا" مَیں نے اونچی آواز میں کہا۔ "آہستہ کھانسو۔ میری آواز تمہاری کھانسی میں گم ہو رہی ہے۔"

وہ برابر کھانسے جا رہی تھی۔

"آشا" مَیں نے غصہ سے کہا۔ "فرصت کے وقت کھانس لینا۔ رات بیتی جا رہی ہے۔"

اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازہ کی طرف دیکھا۔

"دروازے کی طرف نہیں، کھڑکی کی طرف۔ مَیں آ گیا ہوں۔ خواہ مخواہ کھانس کر اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔"

اُس نے دم لے کر پھر کہانی سنانا شروع کر دیا۔

"آشا"

"نرس" آشا نے چلا کر کہا۔

ایک حسینہ کی گڑیا دوڑتی ہوئی اندر آئی اور آتے ہی اُس نے آشا کے منہ میں تھرمامیٹر ٹھونس دیا۔

میں کھڑکی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ معاً ایک سانپ میرے بوٹ پر سے رینگتا ہُوا جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

"چوکیدار" نرس کہہ رہی تھی۔ "ڈاکٹر ہیرپ کو بلاؤ۔ آشا ختم ہو رہی ہے"۔

میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا میں اپنے وارڈ کی طرف چل دیا۔

صبح پتہ چلا کہ آشا اس دُنیا میں نہیں رہی۔ ڈاکٹر ہیرپ کا اب تک یہی خیال ہے کہ آشا دق سے مری لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس بیچاری نے میرے عشق میں گھُل گھُل کر جان دی۔ دق! یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کجا عشق کجا دق!"

"پروفیسر صاحب مجھے آپ سے گلہ ہے۔ آپ کبھی گھر پر نہیں ملتے۔ متواتر تین دن سے آپ سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نہایت ضروری کام ہے۔ آپ مذاق سمجھیں گے لیکن بھئی یہ موقع ہنسی مذاق کا نہیں۔ دستگیری کا ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ میں انگریزی میں ایک محبت نامہ لکھوانا چاہتا ہوں۔ کیتھرین کے نام۔ کون ہے کیتھرین؟ آپ سمجھے کوئی دوغلی لڑکی۔ نہیں بھئی یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ یہ ہے وہ عدیم المثال حسینہ جسے نیویارک

والوں نے سن چوالیس کی ملکۂ حسن کا خطاب دیا ہے۔ یہ دیکھئے اس کی فوٹو۔ کیا پنڈلیاں ہیں ظالم کی! گداز جسم، دلفریب تبسم اور کولھے، کولھے تو آپ نے دیکھے ہی نہیں۔ بھئی اب آپ چاہے کچھ کہیں۔ مجھے تو اس لڑکی سے عشق سا ہو گیا ہے۔ آپ مجھے ایک نہایت پُر تکلف دعوت نامہ لکھ دیجئے۔ لکھنے کو تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بھی لکھ لیتا ہوں لیکن چاہئے اُستاد..... نہایت مرصع اور مقفےٰ نثر ہو۔ ایسی نثر جس پہ شعریت کا گمان ہو سکے۔ نپولین یا بائرن کا اسلوب بیان بس پھڑک اُٹھے اسے پڑھ کر، کیا کرے گی نیو یارک میں۔ نیو یارک میں اُسے مجھ جیسا عاشق تو ملنے سے رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ہالی وڈ کے تاجر اُسے اونے پونے خرید لیں گے۔ ساری عمر نگار خانوں میں پڑی سڑے گی تین چار سال میں دس بارہ طلاق حاصل کر لے گی بھئی ہندوستانی عشاق کی وفاشعاری تو ضرب المثل ہے یہاں تو ہم لوگ سیم تنوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں۔ اچھا تو کب تک لکھ لیں گے یہ محبت نامہ آپ؟ آپ پوچھتے ہیں مجھے عشق ہوا کیسے۔ آپ کو ابھی تک یقین نہیں آیا! پروفیسر صاحب، آپ نے ہونے کی بھی ایک ہی کہی۔ سُنا نہیں وہ آپ نے مرزا غالب کا مصرع ۔۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

خارستان

ایک سیاح نے جو حال ہی میں جزیرہ خارستان سے لوٹا ہے۔ اس جزیرہ کے متعلق چند انکشافات کئے ہیں۔ کہ جو سند باد جہازی کے سفرناموں سے زیادہ سنسنی خیز اور الف لیلے کے قصوں سے زیادہ ہوشربا ہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے "جزیرہ خارستان ہندوستان کے ساحل سے پندرہ سو میل کے فاصلہ پر بحرہند میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں صرف دو قومیں بستی ہیں۔ "ہنگم" اور "بے ہنگم" یہ دونوں قومیں پچھلے ایک ہزار برس سے اس لئے آپس میں برسرپیکار ہیں۔ کہ ہنگم قوم کے افراد اپنے دیوتاؤں کی خوشامد کرتے وقت شمال کی طرف منہ کرتے ہیں۔ اور بے ہنگم جنوب کی طرف۔ نیز ہنگموں کو بینگن کا بھرتہ پسند ہے۔ اور بے ہنگموں کو آلو کا۔ خارستان میں کوئی بے ہنگم اپنی ہتھیلی پہ آلو رکھ کر اس بازار یا محلہ میں سے نہیں گذر سکتا جس میں ہنگم رہتے ہیں۔ چند سال ہوئے اس جزیرہ

ہیں بڑا زبردست ہنگم بے ہنگم فساد ہوا جس میں تین ہزار ہنگم مارے گئے اور تقریباً اتنے ہی بے ہنگموں نے جامِ شہادت چکھا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ہنگم نے ایک عاد بینگن ایک بے ہنگم کے سر پہ دے مارا تھا۔ جس وقت کوئی نووارد خارستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کو اہلِ ہنگم یوں مخاطب کرتے ہیں" اگر آپ نہ ہنگم ہیں نہ بے ہنگم تو ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ بے ہنگم ہیں تو ہم آپ سے لڑنے کیلئے تیار ہیں۔ اگر آپ ہنگم ہیں تو ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ فوراً بے ہنگموں کے خلاف اعلانِ جنگ کیجئے۔"

خارستان میں پچاس فیصدی لوگ نیم پاگل ہیں۔ لیکن خارستان میں ایک بھی پاگل خانہ نہیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیم پاگل کہتا ہے" بٹیر متبرک پرندہ ہے۔ اس کا گوشت نہیں کھانا چاہئے"۔ دوسرا جواب دیتا ہے" بٹیر کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ میں ضرور کھاؤں گا"۔ چند منٹ آپس میں اس مسئلہ پر تکرار کرنے کے بعد پہلا نیم پاگل دوسرے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نیم پاگل ایک دوسرے کے گھروں کو (اور کبھی کبھی اپنے گھروں کو) آگ لگا کر تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔

خارستان میں سب سے عجیب الخلقت انسان "راہنما" ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ راہنما، جن کی کھوپڑیوں میں دماغ سرے سے غائب ہے۔ اور راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ تو ہے لیکن اس کی ساری چولیں ڈھیلی ہیں۔ ہر دو قسم کے راہنماؤں کا شغل "آدم بازی" ہے۔ بٹیروں اور مرغوں کی بجائے یہ لوگ آدمی پالتے ہیں۔ اور اُن کو آپس میں لڑا کر اپنے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ راہنما بننے کے لئے خارستان

ہیں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں۔ جزیرہ کے وسط میں ایک عمارت "لال کوٹھڑی" ہے۔ جو شخص اس عمارت کی سیر کر آتا ہے۔ راہنما قرار دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ لال کوٹھڑی میں جانے سے پہلے کوچوان یا عطار کیوں نہ ہو۔

خارستان کے کھیتوں میں گندم یا دھان کی بجائے سونا۔ چاندی اور جواہرات اُگتے ہیں لیکن خارستانی کسانوں کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہے۔ کہ وہ ساری کی ساری فصل ہمسایہ جزیروں کو بھیج دیتے ہیں۔ اور اس اقدام کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر ہم ان جزیروں کی سرپرستی نہ کریں تو یہ جزیرے بالکل کنگال ہو جائیں۔

خارستان میں زراعتی مشینوں کا استعمال قانوناً ممنوع ہے۔ جو شخص ان مشینوں کے فوائد گنوائے اُسے فوراً سنگسار کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک نووارد ایک دفعہ غلطی سے خارستان میں ایک زراعتی مشین لے آیا۔ اُسے اس مشین کے ساتھ یا نارد مگر سمندر میں پھینکوا دیا گیا۔

خارستان میں عورتوں کی حالت قابلِ رشک ہے۔ بالخصوص بیویوں کی بیشتر خاوند اپنی بیویوں کی عصمت کی پاسبانی اس شدت سے کرتے ہیں کہ اُنہیں لوہے کے بڑے صندوقوں میں بند کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ ساری عمر چشم بد سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس جزیرہ میں بہت سی عورتیں گوشت پوست کی بجائے موم کی بنی ہوئی ہیں۔ ان پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جائے تو فوراً پگھل جاتی ہیں۔ خارستانی عورتوں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ اس سیاح نے چند عورتوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے پتہ چلا کہ سب کی سب گونگی ہیں۔

خارستان میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت توہمات کی ہے۔ غالباً اس لئے کہ

اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ جو شخص توہمات کا بیوپار کرتے ہیں۔ انہیں شعبدہ باز کہا جاتا ہے۔ کاروبار شروع کرنے سے پہلے وہ ایک آدھ شعبدہ دکھاتے ہیں۔ مثلاً کسی چوراہے پر سر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی اونچے درخت سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ کسی اڑتے ہوئے پرندے کو غلیل کا نشانہ بناتے ہیں۔ شعبدہ بازوں کی دکانیں قابلِ دید ہیں۔ کسی نے اپنی دکان میں ایک "مردہ" رکھا ہوا ہے۔ کسی نے کوئی وزنی کتاب یا پتھر۔ کسی نے ایسی تصویر جسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان دکانوں پر صبح و شام دھن برستا ہے۔ خریداروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کوئی مردے کو سلام کر رہا ہے۔ کوئی کتاب کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کوئی تصویر کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔

سماجی لحاظ سے خارستان میں دو جماعتیں ہیں۔ قصاب اور دبیل۔ قصابوں کا پیشہ ذبح کرنا اور دبیلوں کا ذبح ہونا ہے۔ دبیل ضرورت سے زیادہ سادہ لوح اور شریف واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کی پیٹھ پر کوڑے بھی برسائے جائیں تو ناراض نہیں ہوتے۔ عموماً دبیل پیدا اپنے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن مرتے قصابوں کے لئے ہیں۔ ہر قصاب کے گھر دو تالاب ہوتے ہیں۔ ایک خون کا دوسرا شراب کا۔ خون کے تالاب میں دبیل لوگوں کی نعشیں تیرتی رہتی ہیں۔ اور شراب کے تالاب میں طوائفوں اور رقاصاؤں کی۔ قصاب لوگ تعداد میں اتنے تھوڑے اور دبیل اتنے زیادہ ہیں۔ کہ تعجب ہوتا ہے۔ وہ قصابوں سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے۔ سیاح کے خیال میں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دبیلوں کو ذبح ہونے میں لطف آتا ہے۔

خارستان کی خاص چیز یہاں کا نیلام گھر ہے۔ جہاں ہر اتوار کو روحیں نیلام کی جاتی ہیں۔ نیلام گھر کا مالک "روح فروش" کو حاضرین کے سامنے پیش کرنے کے بعد بآواز بلند کہتا ہے۔ "فلاں ابن فلاں اپنی روح بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بولی دیجئے۔ بولی عموماً ڈیڑھ آنہ سے شروع ہوتی ہے اور ڈیڑھ سو روپیہ تک جاتی ہے۔ خارستان میں روحوں کی قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے کہ اُس نے ایک دفعہ ایک راہنما کی روح صرف سات آنے میں خریدی۔

خارستان میں کئی متبرک مقامات ہیں۔ جہاں پاکیزگی کے سوا سب کچھ ہے۔ کئی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ جہاں صرف 'جہالت' کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی باغیچے ہیں جن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ خارستانی راہنماؤں کا خیال ہے۔ کہ جب تک خارستان میں کافی تعداد میں عبادت گاہیں نہیں بنیں گی۔ خارستان کا شیرازہ پریشان رہے گا۔ جہاں تک اِس سیاح کی رائے کا تعلق ہے۔ اُس کی دانست میں تاوقتیکہ خارستان میں بڑے بھاری پیمانے پر پاگل خانے تعمیر نہیں کئے جائیں گے۔ خارستان خارستان ہی رہے گا۔

پھر لکھیئے

بچپن میں سُنا تھا کہ اگر آپ خوش نویس بننا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی لکھیئے۔ پھر لکھیئے اور پھر لکھیئے۔ اُس وقت یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ کامیاب مکالمہ نویس بننے کا بھی یہی گر ہے۔ چنانچہ اگر آپ میں صبر و تحمل کا مادہ نہیں تو آپ چاہے اور کچھ لکھ سکیں۔ فلمی مکالمے نہیں لکھ سکتے۔ فلمی مکالمہ نویسی کا پہلا اصول ہے کہ ڈائریکٹر صاحب کی ذہنی سطح کا خیال رکھا جائے۔ ممکن ہے آپ بہت اچھے مکالمے لکھتے ہوں۔ لیکن اگر ڈائریکٹر صاحب انہیں نہیں سمجھ سکتے تو لکھنے کا فائدہ؟

اس لئے قلم اُٹھانے سے پہلے ڈائرکٹر صاحب سے پوچھ لیجئے۔ کیوں صاحب آپ فلاں لفظ کے معنی جانتے ہیں۔ یا آپ نے فلاں محاورہ سنا ہے۔ اگر وہ اثبات میں سر ہلا دیں تو بیشک اُنہیں استعمال کر لیجئے۔ ورنہ اُس لفظ یا محاورے کو نظر انداز کر دیجئے

اگر آپ ایسا نہیں کریں گے۔ تو ڈائرکٹر صاحب کا مزاج برہم ہو جائے گا۔ آپ لاکھ کہیے گا کہ یہ لفظ ٹھیک ہے۔ یہ محاورہ صحیح ہے۔ وہ اس بات کی رٹ لگائے جائیں گے۔ ہم نے نہیں سُنا۔ اور چونکہ ڈائریکٹر لوگوں نے بہت کم الفاظ یا محاورے سُنے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی معذوری کا خاص خیال رکھیئے۔ بعض اوقات ڈائریکٹر صاحب کسی مستند محاورہ میں ترمیم فرمانا چاہیں تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت دیجئے ورنہ آپ کی ملازمت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

مثلاً آپ نے لکھا ہے "بھیا میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں"۔ اور ڈائریکٹر صاحب فرماتے ہیں "کچی گولیاں کھیلتا نہیں۔ کھانا ہوتا ہے"۔ تو اس حالت میں آپ کو واجب ہے کہ آپ فوراً ڈائریکٹر صاحب پر ایمان لے آئیں اور نہایت انکساری کے ساتھ کہیں۔ "معاف کیجئے عجلت میں کھائیں کی بجائے کھیلیں لکھا گیا"۔ اسی طرح یاد رکھئے کہ فلمی مکالموں میں وہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ جسے عرفِ عام میں آدھا تیتر آدھا بٹیر کہا جاتا ہے۔ یعنی چالیس فیصدی اُردو اور ساٹھ فیصدی ہندی۔ اس لئے آپ ہر فقرہ میں اس تناسب کو مدنظر رکھیئے۔

مثال کے طور ایسا مت لکھئے "معاف کیجئے میری طبیعت ناساز ہے"۔ بلکہ کشما کیجئے۔ میری طبیعت میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے"۔ بعض ڈائریکٹروں کو چند الفاظ سے خاص اُنس ہوتا ہے۔ وہ الفاظ بار بار مکالموں میں دہرایئے۔ مثلاً اگر ڈائریکٹر صاحب کو لفظ "چُغد" پسند ہے تو کسی کردار کے مُنہ سے یہ فقرہ ضرور کہلوایئے "اماں ہم چُغد۔ ہماری قسمت چُغد۔ بیوی چُغد۔ بچے چُغد۔ نوکر چُغد۔ اور تو اور ہمارے گھر کے کُتے چُغد۔ بلیاں اور چُوہے چُغد"۔

مکالمہ نویسی خاصہ دلچسپ شغل ہے بشرطیکہ اسے پیشہ نہ بنایا جائے۔ کہنے کو تو ایک فلم کا مکالمہ بیس پچیس صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام صفحوں کو اکٹھا کیا جائے۔ جو آپ نے لکھے اور ڈائریکٹر صاحب نے ناپسند فرمائے۔ تو اتنی بڑی کتاب تیار ہو سکتی ہے جو کم از کم ضخامت میں ہومر کی اوڈیسی یا بالمیکی کی رامائن کا مقابلہ کر سکے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی دن غریب خانہ پر تشریف لایئے اور اس پلندہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ جو دو ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ صرف ایک فلم کے مکالمے ہیں۔ یہ میں نے کیوں اور کیسے لکھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

ایک دفعہ مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ چند دن ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں خوب محفلیں گرم ہوئیں۔ اس کے بعد یک لخت پیسے ختم ہو گئے۔ ایک دن میں سمندر کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا خودکشی کی جائے یا کسی سے قرض لیا جائے کہ اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے جو اپنی تنگدستی کا رونا رویا تو فرمانے لگے کچھ کام کیوں نہیں کر لیتے؟ میں نے پوچھا "کیسا کام"۔ کہنے لگے "یہی مکالمے وکالمے لکھنے کا"۔ میں نے عاجزی سے کہا "بمبئی میں ہمیں کون پوچھتا ہے"۔ انہوں نے جلدی سے جواب دیا۔ "ایسا مت کہیئے بمبئی میں مکالمہ نویسوں کی اشد ضرورت ہے"۔ اس کے بعد رازدارانہ لہجے میں فرمایا۔ "بھئی بمبئی فلموں کی فیکٹری ہے یہاں ہر تیسرا آدمی پروڈیوسر ہر چوتھا آدمی ڈائریکٹر ہر پانچواں آدمی ڈسٹری بیوٹر ہے۔ میری دو تین ڈائریکٹروں سے جان پہچان ہے۔ کہو تو ان سے بات کروں"۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک ڈائریکٹر کے پاس لے گئے۔ ان کا نام میں اس لیئے نہیں لینا چاہتا کہ کافی گمنام آدمی ہیں۔ پہلے کسی تھیٹر میں پردے اٹھاتے اور گرانے پر ملازم تھے۔ پھر سٹیج پر مسخرے کا پارٹ ادا کرتے رہے۔ بعد کو کسی سٹوڈیو

ہیں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہاں سے ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر کے عہدہ تک پہنچ گئے۔

میرے دوست نے میرا تعارف کرایا۔ ڈائریکٹر صاحب نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور پوچھا۔ "یہ آپ کے ہاتھ میں کونسی کتابیں ہیں"۔

مَیں نے کہا۔ "ارسطو" اور "شیکسپئیر"۔

فرمانے لگے "بُرا نہ مانیئے گا اگر آپ فلمی مکالمے لکھنا چاہتے ہیں تو ارسطو اور شیکسپئیر کو خیرباد کہنا ہوگا"۔

اس کے بعد انہوں نے میری تعلیم۔ فلمی لائن میں تجربہ۔ میری تصنیفات کے متعلق چند باتیں پوچھیں اور سرپرستانہ انداز میں کہا۔ "دیکھئے آپ اس لائن میں مبتدی ہیں۔ اس لئے معاوضہ کا خیال نہ کیجئے۔ اگر آپ کے مکالمے کامیاب ہوئے تو نہ صرف آپ کا نام ہوگا بلکہ منہ مانگے دام بھی ملا کریں گے۔ فی الحال آپ سو روپے قبول کرلیجئے"۔

مَیں نے جرأت کرکے کہا۔ "بہت قلیل رقم ہے"۔ ڈائریکٹر صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "قلیل! آپ کو پتہ ہے زلفی صاحب کو جو آج کل مکالمے لکھنے کا پندرہ ہزار سے کم نہیں لیتے۔ پہلی بار کیا ملا تھا۔ پچیس روپے اور دیسی شراب کی ایک بوتل۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ انہوں نے سٹنٹ پکچر کے مکالمے لکھے تھے اور ہم آپ سے سوشل پکچر کے مکالمے لکھوا رہے ہیں۔ جس میں چوٹی کے ستارے کام کریں گے۔ مس آفتاب جس کو ہم نے ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس سے مبرّا ادا کیا ہے۔ اور مسٹر مشرقی کمار جنہوں نے اسی ہزار روپیہ لیا ہے اور جو صرف ایک مہینہ کام کریں گے"۔ کیونکہ مجھے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے مَیں نے اُن کی پیشکش منظور کرلی۔ انہوں نے مجھے سٹوڈیو میں دس بجے آنے کو کہا۔ اگلے دن مَیں وقت مقررہ پہ سٹوڈیو پہنچ گیا سب سے پہلے انہوں نے

کہانی سُنائی کہ جو انہوں نے خود لکھی تھی۔ نام تھا۔ "ڈنگرا کی چھوری" میں نے سمجھا کہ ڈنگرا کسی شخص کا نام ہے لیکن کہانی سُننے کے بعد معلوم ہُوا کہ ڈنگرا ایک گاؤں کا نام ہے جہاں کے ڈائریکٹر صاحب رہنے والے ہیں۔ کہانی مختصراً یہ تھی۔ "ایک لڑکا کالج سے بھاگ کر ایک گاؤں میں جاتا ہے اور ایک باغ میں ناریل کے درخت پر چڑھ کر گانا گانے لگتا ہے ادھر سے ایک ملاح کی لڑکی آتی ہے اور اُسے پتھر کا نشانہ بنا کر زخمی کر دیتی ہے۔ لڑکا درخت سے نیچے گر پڑتا ہے۔ لڑکی اُسے اُٹھا کر گھر لے جاتی ہے۔ تیمارداری کے دوران میں اُسے لڑکے سے عشق ہو جاتا ہے۔ ایک رات وہ گھر سے بھاگ نکلتے ہیں۔ لڑکی کا باپ غم میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ لڑکا ایک تھیٹر میں ملازمت کر لیتا ہے۔ جہاں اُسے ایک رقاصہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ ایک دن رقاصہ اور وہ لڑکا تھیٹر سے بھاگ نکلتے ہیں اور کسی شہر میں جاتے ہیں۔ وہاں رقاصہ کو ایک نواب سے عشق ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُس کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔ لڑکا مایوس ہو کر خودکشی کرنے کی غرض سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ عین اس موقع پر ملاح کی لڑکی کشتی لے کر سامنے سے نمودار ہوتی ہے۔ اور اُس کی جان بچاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔"

کہانی سُنانے کے بعد۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیسی ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا "عجیب سی ہے"۔ انہوں نے ہیں بے تاب ہو کر کہا "کیا مطلب ارے میاں یوں کیوں نہیں کہتے کہ تہلکہ مچ جائے گا"۔ "تہلکہ" میں نے حیرت سے کہا "تہلکہ"۔ انہوں نے دہرایا "ہاں ہاں تہلکہ۔ دیکھو۔ اس کہانی میں آٹھ کلائمکس ہیں۔ بارہ گانے ہوں گے۔ تین ناچ اور پانچ سٹار۔ تہلکہ کیسے نہیں مچے گا"۔ اس کہانی کو انہوں نے ایک سو چھبیس چھوٹے بڑے مناظر میں تقسیم کیا ہُوا تھا۔ چنانچہ مجھے چند عملی ہدایتیں دیکر کہا۔ کہ مکالمے لکھنا

شروع کر دیجئے۔" پہلا سین کالج کا کمرہ تھا جس میں پروفیسر لڑکوں سے سوال کرتا ہے۔ وہ اُس کا مذاق اُڑاتے ہیں میں نے اس سین کے مکالمے بہت احتیاط سے لکھے اور کوشش کی کہ نوک جھونک شائستہ اور بر جستہ ہو۔

دوسرے دن ڈائریکٹر صاحب کو وہ سین دکھایا۔ انہوں نے سرسری نظر سے اُسے دیکھا اور فرمانے لگے "بات نہیں بنی۔ اسے پھر لکھئے"۔ حسب ارشاد اسے دوبارہ لکھا۔ "کہنے لگے یہ تو پہلے سے بھی پتلا ہے ایک بار پھر لکھئے" پھر لکھا ارشاد ہوا۔" اس میں صرف ایک فقرہ کام کا ہے ایک بار پھر کوشش کیجئے۔" ایک بار پھر کوشش کی۔ کہنے لگے "مزہ نہیں آیا۔" میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "تو آپ فرما دیجئے کہ کیسے لکھوں"۔ ہاتھ کو گھما کر کہنے لگے۔ "میرا مطلب ہے اسے یوں لکھا جائے کہ یوں ہوتا ہوا یوں ہو جائے"۔ میں نے کہا بہتر۔ چنانچہ جی کڑا کر کے ایک بار پھر لکھا۔ پڑھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ نہیں چلے گا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کس قسم کا سین چاہتے ہیں"۔ کہنے لگے۔ جسے دیکھ کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائیں۔ اور یہ کہہ کر مسکرانے لگے۔ میں نے کہا۔ آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔ جواب دیا ایک خیال سوجھا ہے۔ دیکھئے آپ ایسا کیجئے کہ ایک لڑکا اپنے ساتھ کلاس روم میں ایک پلا لے آئے۔ پروفیسر صاحب اُس سے پوچھیں۔ "ارے یہ کیا"۔ وہ لڑکا کہے "آپ کا نیا شاگرد"۔ پروفیسر کہے" اور آپ کا نیا ہم جماعت" اس کے بعد۔ پلا بھونکے اور ایک لڑکا کہے۔" پروفیسر صاحب۔ یہ تو بالکل آپ کی طرح انگریزی بولتا ہے۔" اور پروفیسر کہے کم از کم آپ سے تو بہتر انگریزی بولتا ہے"۔ ہاہاہا۔ "کیوں کیسا رہا۔ میں کہتا ہوں اگر آپ یہ سین لکھ گئے تو آپ آغا زلفی کو مات کر دیں گے"۔

چنانچہ چھٹی بار یہ سین اُن کی ہدایات کے مطابق لکھا اور پسند کیا گیا۔

دوسرا سین تھا۔ دریا کا کنارا۔ اِس سین میں ملاح کی لڑکی مچھلیاں پکڑ رہی ہے اور چند نوجوان اس پر آوازے کس رہے ہیں۔ یہ سین آٹھ بار لکھا گیا۔ اور ہر بار ناپسند کیا گیا۔ آخر ڈائریکٹر صاحب کو پھر ایک خیال سوجھا اور کہنے لگے۔ دیکھو بھئی یہ سین یوں لکھو۔

پہلا نوجوان۔ مچھلی تو اچھی ہے۔ مگر جال میں پھنستی نظر نہیں آتی۔

دوسرا نوجوان۔ بچ کر کہاں جائے گی۔ ہم بھی معمولی ماہی گیر نہیں۔

تیسرا نوجوان۔ لو اب پھنسی کہ پھنسی۔

(لڑکی اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

چوتھا نوجوان۔ دیکھو بھئی پہلے ہی حصے بخرے کر لو۔ آنکھیں میں لوں گا۔

پہلا نوجوان۔ اور منہ میں۔

تیسرا۔ اور دھڑ میں۔

چوتھا۔ اور میں کیا لوں گا۔

پہلا۔ تم؟ بھئی تم مچھلی کی دُم۔

(قہقہہ۔ لڑکی ڈر کر دریا میں گر پڑتی ہے۔ قہقہہ)

اتنا کہہ کر فرمانے لگے آخری فقرہ اس سین کی جان ہے "تم مچھلی کی دُم" دیکھئے کیا ذومعنی فقرہ ہے "تم مچھلی کی دُم"۔

اِس کے بعد ناریل کے درخت کا سین تھا۔ لڑکا ناریل توڑ رہا ہے اور ملاح کی لڑکی اُسے دیکھ رہی ہے۔ پہلے وہ ایک دوست کے ساتھ سخت کلامی سے پیش

آتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی پتھر اُٹھا کر اُسے مارتی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ اس سین میں زیادہ سے زیادہ گالیاں استعمال کی جائیں کیونکہ پبلک گالیوں پر خوب ہنسے گی اور مروجہ گالیوں کے علاوہ چند نئی گالیاں ایجاد کی جائیں۔ چنانچہ ایک دن چائے پینے کے بعد ہم دونوں نئی گالیوں کی اختراع کرنے لگے۔

میں نے کہا۔ "چنڈول کا بچہ"۔ کہنے لگے "نہیں چلے گا"۔

"مستول کا بچہ"۔

"نہیں چلے گا"۔

"ابوالہول کا بچہ"

"نہیں چلے گا"۔

"پستول کا بچہ"۔

کرسی سے اچھل کر کہنے لگے "چل جائے گا۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ لیکن یہ کچھ عجیب سی گالی"۔

فرمانے لگے "میاں یہ فلمی دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ چلتا ہے۔ پستول کا بچہ بہت اچھا ہے اسے ضرور رکھئے"۔

ایک دن خلاف معمول ڈائریکٹر صاحب کو ایک مکالمہ بہت پسند آیا۔ بہت تعریف کی۔ چٹخارے لے لے کر پڑھا۔ تین چار مرتبہ پڑھنے کے بعد کہنے لگے "لیکن بھئی اس میں تھوڑا سا ردو بدل کرنا پڑے گا۔ دیکھئے جہاں آپ نے لکھا ہے "زندگی بے رنگ و بو ہے"۔ "وہاں کر دیجئے زندگی میں رنگ نہیں بو ہی بو ہے"۔ اور جہاں آپ نے لکھا ہے۔ "نراشا کے اندھیارے میں آشا کی کرن چمک اٹھی"۔ وہاں کر دیجئے۔ "اماوس کے

اندھیارے میں پورنماشی کا چاند چمکنے لگا۔ اور "میں غریب ہوں جاہل نہیں"۔ کی بجائے یہ لکھئے "اگر میں غریب ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بالکل گدھا ہوں"۔

میں آداب بجالایا اور بے اختیار کہہ اُٹھا "ہائے استاد خالصیت"۔

اب مجھے دو تین محبت کے سین لکھنے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب چاہتے تھے۔ کہ یہ سین کافی زوردار ہوں۔ اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ میں چند فقرے "رومیو اور جولیٹ" سے لیکر اس سین میں شامل کر دوں۔

رومیو کا انہیں یہ فقرہ بہت پسند آیا۔ "کاش میں دستانہ ہوتا۔ تاکہ تیرے رخسار کو چھو سکتا"۔ کہنے لگے "بالکل نئی چیز ہے"۔ میں نے کہا۔ لیکن ہماری کہانی کا ہیرو تو موسم گرما میں محبت کر رہا ہے۔

دستانے کا کیا مطلب۔ فرمانے لگے "تو دستانے کی بجائے انگوٹھی کر دیجئے"۔

ایک شام کو ڈائریکٹر صاحب نے ایک انگریزی فلم دیکھی۔ دوسرے دن مجھے بلایا۔ اور کہا۔ "دیکھو بھئی میں نے کل ایک انگریزی فلم دیکھی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ کہ ایک لڑکی سکول سے بھاگ کر ایک گھنے جنگل میں جا چھپتی ہے۔ وہاں ایک شکاری آتا ہے۔ جسے اُس پر ہرنی کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ اُسے بندوق کا نشانہ بناتا ہے۔ لڑکی زخمی ہو جاتی ہے۔ اور شکاری اُسے گھوڑے پر بٹھا کر گھر لے جاتا ہے.... اُسے لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے ہم بھی اپنی فلم کا آغاز اسی طرح کریں۔ اس لئے آپ آغاز کے دس بارہ سین پھر لکھیے"۔

میں نے پوچھا۔ "مگر اس واقعہ کے بعد ہیرو اور ہیروئین کیا کرتے ہیں"۔ سر کھجلا کر کہنے لگے۔ "یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ آپ بھی سوچئے"۔

"اُس انگریزی فلم میں کیا دکھایا گیا ہے"؟

"خوب یاد دلایا بھئی وہاں تو وہ دونوں ایک سرکس میں ملازم ہو جاتے ہیں"۔

"تو ہم بھی انہیں سرکس میں بھیج دیں"۔

"سرکس ٹھیک نہیں رہے گا۔ کاپی رائٹ کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ ہم اُنہیں تھیٹر میں ہی بھیجیں گے۔ جیسا کہ ہماری کہانی میں ہے"۔

اُن کی فرمائش کے مطابق آغاز کے سین پھر لکھے۔

اس اثنا میں فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اور اب ہر روز ڈائریکٹر صاحب انہیں مکالموں سے مایوس ہونے لگے جنہیں انہوں نے کئی بار لکھوانے کے بعد پسند کیا تھا۔ ایک دن گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

"بھئی وہ جو تم نے ایک جگہ گلہری کا لفظ استعمال کیا ہے وہ ہیروئن کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ میں اُسے کہتا ہوں کہو گلہری وہ کہتی ہے گل ہری۔ اس کے لئے کچھ آسان لفظ بتایئے"۔ میں نے کہا "گلہری کے لئے تو گلہری سے زیادہ آسان لفظ کوئی نہیں۔ آپ گلہری کی بجائے کوئی دوسرا جانور رکھ لیجئے"۔ پوچھنے لگے۔ "مینڈک ٹھیک رہیگا"۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر مجھے سٹوڈیو میں بلا بھیجا۔ سر پیٹ کر فرمانے لگے۔ "عجیب مصیبت ہے اس بنگالی ایکسٹرا لڑکی کی زبان پر "بانسری" کا لفظ نہیں چڑھتا۔ میں کہتا ہوں بانسری وہ بال چھری کی رٹ لگائے جاتی ہے۔ اب بانسری کے لئے کوئی اور لفظ بتایئے"۔ میں نے کہا "سارنگی"۔

ڈائریکٹر صاحب نے لڑکی سے کہا کہو سارنگی۔ اُس نے ہونٹوں کو گول بناتے ہوئے کہا۔ "چھارنگی"۔

"چھارنگی نہیں۔ سارنگی"۔

"ہاں ہاں چھارنگی۔ چھارنگی"۔

ڈائریکٹر صاحب نے چلّا کر کہا "سارنگی"۔ لڑکی نے چلّا کر کہا "چھارنگی"۔ ڈائریکٹر صاحب نے دوبارہ سر پیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کوئی ایسا ساز بتایئے۔ جس میں "س" کا حرف نہ ہو"۔ میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "طنبورا"۔

بمبئی سے رخصت ہونے سے تین چار دن پہلے ڈائریکٹر صاحب فرمانے لگے۔ کہانی کا آغاز تو شاندار ہو گیا۔ لیکن انجام کے متعلق مجھے شک ہے۔ میرے خیال میں اگر کہانی کا ہیرو زناصہ سے مایوس ہو کر فقیر بن جائے۔ اور اس کی پہلی محبوبہ فقیرنی۔ اور دونوں گاتے گاتے کسی گلی کے نکڑ پر ملیں تو انجام بہتر ہو جائے گا"۔

"آپ کا کیا خیال ہے"۔ میں نے کہا۔ "ان معاملوں میں آپ کا فیصلہ قطعی ہوتا ہے۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا"۔

"نہیں نہیں کہیے"۔

"مجھے تو یہ انجام بھی اتنا غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا"۔

"کم از کم پہلے انجام کی نسبت یہ کم غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے"۔

"ہاں"۔

"تو پھر آپ انجام کے دو چار سین پھر لکھ دیجئے"۔

"بہتر"۔

انجام کے سین دوبارہ لکھے گئے۔ ان میں ایک سین میں نے پندرہ بار لکھا۔ اس سین کو پڑھنے کے بعد ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے۔ اگر مکالمے کی بجائے یہاں

دوگانا رکھ دیا جائے تو کیسا رہے۔ مَیں نے بیدی سے کہا دوگانا بھی ہو سکتا ہے۔ کہنے لگے۔ "تو یہیں رہنے دیجئے مَیں مدھو پال جی سے کہہ دوں گا کہ ایک دوگانا اور لکھ دیں۔"

جب مَیں نے بمبئی کو خیرباد کہا تو ڈائریکٹر صاحب اسٹیشن پر مجھے وداع کرنے آئے اور فرمانے لگے "مَیں رات کو چند سینوں کے مکالمے پڑھ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اُن میں ابھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن نہیں اپنے ساتھ لیتے جایئے اور لاہور جا کر انہیں ایک بار پھر لکھئے۔" اور پیشتر اس کے کہ میں ہاں یا نہ کر سکتا۔ انہوں نے بیس پچیس صفحات کا مسودہ میرے بڑے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔

روٹی تو کسی طور......

؎ "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید"! میں وہ بدقسمت انسان ہوں جس کی اُمید مرنے پہ منحصر ہے۔ اپنے مرنے پہ نہیں۔ دوسروں کے مرنے پر۔ ہر رات سونے سے پہلے دعا مانگتا ہوں۔ "یا رب العالمین! فلاں شاعر۔ فلاں لیڈر۔ فلاں محب الوطن اب تو کافی بوڑھا ہوگیا۔ پچھلے دس برس سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اب تو اُسے اُٹھالے۔ اب تو بیچارے کے نہ ہاتھوں میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم! اُسے جنت میں جگہ دے یا جہنم میں۔ کم از کم مجھے اُس کے نام پر چندے کا ایک نیا فنڈ کھولنے کا موقع دے۔ میں اُس کا بت نصب کروں گا۔ اُس کی یاد میں عظیم الشان لائبریری قائم کرنے کے لئے اپیل کروں گا اُس کے پسماندگان کی امداد کے لئے قوم سے خیرات مانگوں گا۔ پانچ ہزار۔ دس ہزار۔ پچاس ہزار۔ آخر کچھ تو قوم کی جیب سے نکلے گا ہی۔

اے ذوالجلال۔کل کے اخبار میں پہلی سُرخی جو پڑھوں وہ کسی بڑے لیڈر کی موت سے متعلق ہو۔خداوندا میری مالی مشکلات تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ لڑکے کو ولایت بھیجنا ہے۔لڑکی کی شادی نزدیک آرہی ہے۔کم از کم پندرہ ہزار روپیہ چاہیئے۔اگر اس مہینے تین لیڈروں کا جنازہ اُٹھے۔ تو یہ رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔اے خدا! تو قادرِ مطلق ہے۔تین لیڈروں کو قیدِ حیات سے نجات دلانا تیرے لئے چنداں مشکل نہیں۔ اور اگر یہ کسی طرح ناممکن ہے تو پھر کوئی قحط ۔سیلاب یا کچھ نہ کچھ ہی بھیج۔بنگال کا قحط تو پُرانا ہو چکا۔اب تو کسی نئی آفت کی ضرورت ہے۔کوئی وبا۔کوئی طوفان۔ پلیگ۔ہیضہ۔ٹڈی دل۔کوئی ایسی مصیبت جس کے نام پر سنگدل سے سنگدل انسان چندہ دینے پر مجبور ہو جائے۔

"جی ہاں میرا ہی نام ہے۔آقا طہرانی۔مَیں طہران کا رہنے والا ہوں تعلیم یہی سات جماعت۔آباؤاجداد ہینگ کا بیوپار کرتے تھے۔اُن کی تقلید میں ہینگ بیچتا ہوا بمبئی پہنچا۔دیکھا کہ بمبئی کے لوگ ہینگ سے سخت نفرت کرتے ہیں ہینگ۔ چھوڑ کر گیتوں کی تجارت شروع کر دی۔اب مَیں فلموں کے لیے گیت لکھتا ہوں۔ہر قسم اور ہر موقع کے گیت۔ہجر کے گیت۔وصال کے گیت۔شادی کے گیت۔طلاق کے گیت۔ ڈھولک کے گیت۔ناچ کے گیت۔ایک گیت پانچ روپے میں بیچتا ہوں۔خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔صبح و شام بمبئی کے سٹڈیوز کا طواف کرتا ہوں۔گلے میں ہارمونیم چوبیس گھنٹے لٹکا رہتا ہے۔جب دیکھتا ہوں کہ کوئی نیم خواندہ پروڈیوسر پریشان خاطر نظر آتا ہے۔فوراً جھٹ اُٹھا کر آداب بجا لاتا ہوں۔اور نہایت

انکساری کے ساتھ کہتا ہوں سیٹھ صاحب۔ تازہ فلم کے لئے گیت چاہیئے؟ سیٹھ صاحب ہارمونیم پر گیت کی طرز سنتے ہیں۔ سر ہلا ہلا کر داد دیتے ہیں۔ اور منٹوں میں گیت کا سودا ہو جاتا ہے۔ گیتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہتا ہوں۔ ان میں وزن اور معنی کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ آپ کی دعا سے اس وقت بمبئی کا ہر جاہل ڈائریکٹر میرا لوہا مانتا ہے۔ یوں تو کمپنیوں کے پاس اپنے شاعر بھی ہیں۔ لیکن وہ ٹھہرے بیچارے ادیب۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ مغز زنی کے باوجود سیٹھ صاحب کی پسند کا گیت نہیں لکھ سکتے۔ اُس وقت آغا طہرانی کو فون کیا جاتا ہے۔ کئی بار ان شاعروں سے ٹکر لے چکا ہوں۔ ہمیشہ انہیں سمجھاتا ہوں "کم بختو۔ گیت لکھنے سے پہلے ہارمونیم بجانا سیکھو۔"

"جی ہاں آپ صحیح فرماتے ہیں۔ یہ سب پیٹ کا دھندا ہے۔ ورنہ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی آدمی بیس گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہو۔ یہ قبر جس کا میں مجاور ہوں۔ کسی فرضی ولی اللہ کی ہے۔ میں اُسے پیر بیس گزہ کے نام سے پکارتا ہوں۔ در اصل اس قبر میں کسی مُردے کو دفن نہیں کیا گیا۔ پانچ سال ہوئے میں نے رات بھر جاگ کر اسے تیار کیا۔ مجاور بننے سے پہلے میں بھیک منگا تھا۔ لوگ مجھے دھتکارتے تھے۔ اب میری پرستش کرتے ہیں۔ یوں تو ہر شخص پیر بیس گزہ کا معتقد ہے۔ لیکن طوائفوں کو اُن کے مزار سے خاص طور پر عقیدت ہے۔ سال میں دو بار عُرس لگتا ہے۔ بمبئی۔ کانپور اور بنارس سے طوائفیں آتی ہیں۔ ہر ایک طوائف کے جلو میں درجنوں تماشبین ہوتے ہیں۔ طوائفیں غزلیں گاتی ہیں۔ قوال قوالیاں سناتے ہیں۔ خاصی رونق ہو جاتی ہے۔ ان سب کو عُرس کی آمدنی سے کمیشن ملتی ہے۔ یقین مانئے آج

تک کوئی شخص اس مزار سے مایوس نہیں لوٹا - بانجھ عورتیں، ناکام عاشق - شکست خوردہ انسان روتے ہوئے آتے ہیں - اور ہنستے ہوئے گئے ہیں - آپ ٹھیک کہتے ہیں جتنی آمدنی مجھے ایک عرس کے موقع پر ہوتی ہے - اس سے پانچ سکول اور دس ہسپتال کھولے جا سکتے ہیں - لیکن مجھے ہسپتالوں اور سکولوں سے غرض - مجھے چاہیئے شراب - خوبصورت عورتیں - جوا کھیلنے کے لئے روپیہ - اور ساری نعمتیں - مجھے پیر بیس گزہ کی عنایت سے میسر ہیں - پیر بیس گزہ! جو نہ کبھی پیدا ہوا - نہ مرا - لیکن جس نے مجھ جیسے قلاش کو پانچ سال کی قلیل مدت میں بھک منگے سے جاگیردار بنا دیا"

"ہاں صاحب اس وقت میں تقریباً ڈیڑھ سو فحش کتابوں کا مصنف ہوں - عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوں - کار میں سفر کرتا ہوں - تین بیویاں ہیں - چار نوکر ہیں - جی ہاں - یہ سب فحش کتابوں کی بدولت ہے - پہلے پہل میں نے بھی شریف آدمیوں کی طرح دو ایک سنجیدہ کتابیں لکھیں - نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات - اتنی آمدنی بھی نہ ہوئی - کہ ایک اچھا سا کوٹ سلوا سکتا - اب خدا کا فضل ہے - ادھر کتاب چھپی - اُدھر ایڈیشن ختم - بعض اوقات تو کتاب چھپنے سے پہلے ہی ایڈیشن ختم ہو جاتا ہے - یوں تو سارے ہندوستان میں میری کتابوں کی دھوم ہے - تاہم پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ان کی خاص مانگ ہے - لطف یہ کہ لکھتے وقت زیادہ محنت بھی نہیں پڑتی - تین چار بنے ہوئے پلاٹ ہیں - انہیں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ہر کتاب میں دہرا دیتا ہوں - ایک پلاٹ ہے - شریف گھر کی

دوشیزہ جس نے خانساماں سے عشق کیا۔ اور جو بعد کو ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ایک پلاٹ ہے کالج کی لڑکی جس نے کالج کے ہر لڑکے کے ساتھ آنکھیں لڑائیں۔ اور ایک پلاٹ ہے شریف زادہ جو شہر کی ہر طوائف کے پاس گیا۔ خود غرض اور حاسد قسم کے لوگ کہتے ہیں۔ میں ہندوستانیوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہوں۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ ہندوستانیوں کا اخلاق ہے ہی کیا۔ جسے بگاڑا یا سنوارا جائے۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ہندوستانیوں کا بھی اخلاق ہے تو میں پوچھتا ہوں جب رشوت ستانی۔ غداری۔ نا اتفاقی اور اس قسم کی ہزاروں لعنتیں اسے تباہ نہیں کر سکیں تو میری تصنیفات کی کیا بساط ہے۔ صاحب یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ عوام کو دلچسپ کتابوں کی ضرورت ہے۔ مجھے روپے کی۔ اخلاق سے نہ عوام کو غرض ہے نہ مجھے۔ اب خواہ مخواہ کوئی معلم اخلاق چیں بہ جبیں ہوتا رہے تو ہوا کرے۔ آخر میں اس کی خاطر اپنی روش بدلنے سے تو رہا!!!

جہاں گرد

کہتے ہیں جب رانجھا جوگی کے بھیس میں پہلی بار جھنگ میں داخل ہُوا۔ تو پنگھٹ پر کھڑی ہوئی کنواریوں میں اس کے متعلق عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایک نے کہا۔ "بہروپیا ہے"۔ دوسری بولی۔ "نوجوان لڑکیوں کو بہکانے آیا ہے"۔ تیسری نے آہستہ سے کہا۔ "عشق کی چاٹ لگی ہے"۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ——— دیویندر ستیارتھی کی شخصیت کے متعلق بھی اسی قسم کے عجیب انداز سے لگائے گئے ہیں۔ کسی کی دانست میں وہ تارک الدنیا ہے۔ کوئی ٹیگور کا چربہ بتاتا ہے۔ اور کوئی خواجہ حسن نظامی کا ہندو ایڈیشن۔ یہ سب غلط فہمیاں اس کی داڑھی اور لمبی لمبی جٹاؤں سے پیدا ہوئیں ہیں۔

میں نے ستیارتھی کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جب اس کی داڑھی بہت لمبی تھی۔

اور اس کی وضع قطع ٹیگور سے خطرناک مشابہت رکھتی تھی۔ جب اُس نے داڑھی کٹوا ڈالی اور بزرگ کی بجائے چھوکرا نظر آنے لگا۔ اور اب کہ اس نے پہلی اور دوسری حیثیت میں سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اور اس پر عربی یا حجازی درویش کا دھوکہ ہوتا ہے بیشتر دوستوں کی نگاہ میں ستیارتھی فقط داڑھی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ "داڑھی جمع زلفیں" میں نے ستیارتھی کو کبھی محض "داڑھی" نہیں سمجھا۔ داڑھی کے علاوہ وہ "بڑی بڑی روشن آنکھیں" اور "پیاری پیاری دلکش آواز" بھی ہے۔ داڑھی کے علاوہ وہ دماغ بھی ہے۔ سوچنے اور سمجھنے والا دماغ۔ لوگوں کو انگلیوں پہ نچانے والا دماغ۔ جن تلوں میں تیل نہیں اُن سے تیل نکالنے والا دماغ۔ اور اردو افسانہ نویسی میں ایک نئے سکول کی داغ بیل ڈالنے والا دماغ۔

ازل سے اس کے پیر میں چکر ہے اور ابد تک رہے گا۔ اُسے خضر کی طرح گھومنے میں لطف آتا ہے۔ آج اگر وہ لنکا کے ساحل پر کھڑا لہریں گن رہا ہے تو کل ہمالہ کی یخ بستہ چوٹی پر برفانی تودوں سے نبرد آزما ہے۔ آوازیں اُسے پکارتی ہیں گھنگھروؤں کی چھن چھن چھنانن۔ طبلے اور ڈھولوں کی دھم دھم دھما دھم ——— ان آوازوں کے تعاقب میں وہ صحراؤں کو چیرتا، دریاؤں کو پیرتا اور پہاڑوں کو پھاندتا کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ گونڈوں میں گونڈ، بھیلوں میں بھیل اور سنتھالوں میں سنتھال بن کر رہتا ہے۔ اس لامتناہی سفر میں اس کا صرف ایک ساتھی ہے۔ اس کی داڑھی اس داڑھی کی آڑ میں وہ عجیب و غریب شکار کھیلتا ہے۔ اس داڑھی کے سہارے وہ الھڑ گنواریوں کے جھرمٹ میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ شرمیلی دلہنوں سے گھونگھٹ اٹھانے کو کہہ دیتا ہے۔ بیٹیوں اور بہوؤں سے ہنسی ٹھٹھول کرتا ہے۔ اور جب اس کی

جیبیں خالی ہوتی ہیں تو بلا ٹکٹ سفر بھی کر لیتا ہوں۔

اُس نے راجپوتانہ کی تپتی ہوئی ریت پر تھکے ماندے پاؤں رکھے ہیں گلگت کی یخ بستہ برف کو سینے سے لگایا ہے۔ بپھری ہوئی لہروں سے دست و گریباں ہوا ہے اُس کے طویل سفر میں کئی موقعے ایسے بھی آئے ہیں جب وہ کھلی ہواؤں، سخت اور پتھریلی چٹانوں پر آسمان کی چھت تلے سویا۔ کئی بار ستاروں نے آنکھیں جھپکا کر اس سے پوچھا "پگلے! تمہارے دماغ میں یہ کیا خبط سمایا ہے۔ لوک گیت جمع کروگے؟ چاہے تمہیں عمرِ خضر نصیب ہو تو بھی اس طویل عریض سرزمین کے گیت جمع نہیں کر سکتے" ——————

لیکن صرف ستارے ہی اس سے یہ سوال نہیں کرتے۔ بارہا سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگوں نے اس کی داڑھی کو جھنجھوڑ کر اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ وہ واقعی مصنوعی نہیں۔ اس سے پوچھا ہے —— "تم لوک گیت کیوں جمع کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم کسی کمپنی کے ایجنٹ ہو؟ تمہیں ان گیتوں سے مالی فائدہ کبھی ہوگا؟"

وہ ان سوالوں کا کچھ جواب نہیں دیتا۔ خاموش، چپ چاپ، تنہا۔ ہندوستان کی کبھی نہ ختم ہونے والی شاہراہوں پر گامزن ہے۔ ایک جنون، ایک بے نام تڑپ اسے ہر وقت مضطرب رکھتی ہے۔ ہندوستان میں وہ واحد ادیب ہے۔ جسے ٹیگور کا قرب، پریم چند کی رفاقت، سروجنی نائیڈو کی تحسین، گاندھی کی شفقت اور چودھری نذیر احمد کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اس کے باوجود وہ مظلوم ترین فن کار ہے۔ لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ عورتیں اسے دیکھ کر زیر لب مسکراتی ہیں۔ وہ شخص جنہوں نے ایک سطر نہیں لکھی جنہوں نے گھر سے باہر ایک قدم نہیں رکھا۔ اس پر پھبتیاں کستے ہیں۔ اس کے خلوص کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ لوک گیت جمع کر کے اس

نے کتنا بڑا کام کیا ہے ۔

بادی النظر میں لوک گیت ایک بے کار، بے مصرف سی چیز ہے۔" آخر لوک گیتوں میں ہے ہی کیا ؟ یہ ہے گیتوں کے متعلق ایک عام آدمی کا ردِّ عمل ۔ عام آدمی کی بات چھوڑیئے ——— کبھی کبھی تو ایک ذہین قاری کو بھی یہ شک گزرتا ہے۔ کہ لوک گیت جیسی حقیر صنف پر وقت صرف کرنا بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے۔ شک کے انہی لمحوں میں اُس سے کہتا ہوں ———

"ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ایک فضول چیز کی خاطر تم نے عمرِ عزیز کے بیس سال ضائع کر دیئے ۔"

وہ اپنی مدھم اور شیریں آواز میں جواب دیتا ہے۔" لوک گیتوں کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے گیتوں کے جادو کو محسوس کیا ہے۔ یہ مدھ بھرے گیت جو ان گنت صدیوں سے گائے جا رہے ہیں جن کا ایک ایک بول ساری قوم کو مرنے مارنے پر اُبھار سکتا ہے۔ جن کی پُرسوز تان مُردہ قوم کے احساس خودی کو بیدار کر سکتی ہے۔ جن کی تند و تیز طنز ایک گئے گزرے ملک پر تازیانے کا حکم رکھتی ہے۔ یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں منظرِ عام پر لایا جائے تم نہیں سمجھ سکتے ۔ یہ صرف ٹیگور یا صوفیا داڈ بابا کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ کہ اس بدقسمت ملک کو جس کا نام "ثقافتستان" ہے ان گیتوں کی کتنی ضرورت ہے ۔"

میں مشکوک نظروں سے اس کی داڑھی کی طرف دیکھتا ہوں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ کہتا ہے۔" ڈھول کی بھاری بھرکم آواز، بانسری کی مہین، اور سُریلی تان اور گھنگھروں

کی سحر آفریں جھنکار میں اُونچ نیچ، ذات پات، ہندو مسلمان کے تفرقات غرق ہی نہیں ہوجاتے ہمیشہ کے لئے فنا بھی ہوجاتے ہیں۔ آزادی کا نغمہ سننے پر غلامی کی زنجیریں ڈھیلی ہی نہیں ہوتیں۔ ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ لوک گیت تو قوم کا دفینہ ہیں اے دوست! ——— ایسا دفینہ جو عوام کے سینوں اور دماغوں میں مدفون ہے۔ اور جس کی کھوج وہی لگا سکتا ہے، جو ....."

"جو بھلا چنگا انسان ہوتے ہوئے بھی قلندر نظر آئے۔"

"تم چاہے کچھ ہی کہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان گیتوں کی کھوج میں قلندر کی طرح ایک صوبہ سے دوسرے صوبے تک گھوما ہوں۔ بھک منگوں کی طرح اپنا کشکول لے کر ہر اس شخص کے پاس گیا ہوں جو اس میں لوک گیت کی چٹکی ڈال سکتا تھا۔ میں نے جواہرات کی مانند ان گیتوں کی قدر کی۔ قیمتی پتھروں کی طرح انہیں سینے سے لگایا۔ کاش! تم اس بات کا اندازہ لگا سکتے۔ کہ ان گیتوں کی خاطر میں نے کس کس کے ناز اُٹھائے۔ سانولی سلونی بنجارنوں کے ناز۔ خوددار گرھوالنوں کے ناز۔ ہرنیوں کی مانند ہمالہ کی وادیوں میں چوکڑیاں بھرنے والی نیپالنوں کے ناز۔ ذرا سی بات پر چمک کر راہگیروں پر خونی وار کرنے والی پٹھانیوں کے ناز ....."

اور میں جھٹ لقمہ دیتے ہوئے کہتا ہوں ——— "کالی کلوٹی میراثنوں کے ناز۔ ناک چڑھی گستاخ نٹنیوں کے ناز۔ بدبو اور تعفن میں بسی ہوئی مہترانیوں کے ناز....

ہندوستان کی پچاس نمائندہ زبانوں میں سوا تین لاکھ گیت جمع کرنے کے بعد وہ گھر لوٹتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں وہ گردشِ مدام سے گھبرا گیا ہے آخر انسان ہے

پیالہ و ساغر تو نہیں لیکن یقیناً وہ دم لینے کے لئے نہیں رُکا۔ جب تک اُس کا مقصد پُورا نہ ہو جائے۔ وہ کیسے دم لے سکتا ہے؟ لوک گیت تو جمع ہو گئے لیکن اصلی کام تو ابھی باقی ہے۔ ان گیتوں کی ترتیب و تدوین ——— اپنی تنگ و تاریک جھونپڑی میں دیئے کی مدھم لو میں بیٹھا وہ ان گیتوں کو مرتب کر رہا ہے۔ گرمی کی حدت سے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔

اس کے اردگرد ہزاروں گیت بکھرے پڑے ہیں۔ پنجاب کے گیت ——— ڈھولک کے نغمے، گِدّا اور جھومر ناچ کی تانیں، ماہیا، ڈھولا، بالو، جگا۔ "ہر نام کور، نا بھے دِیئے بند بو تلے"۔ "میری رُس گئی جوتا بجراں دالی"۔ "راتیں یار نے گلے نال لا یا"۔ کانگڑا اور کلو کے دِل کی دھڑکنیں ——— "ہاہمنا دیا چھوڑ دو آ، دھارا رالیبیرا پانی دور ارا"۔ اودھ کے گیت ——— "گونیاں جلوا ہجرا کے گیت!" "سنار سماری مود ٹیکے بیں میل بھئی"۔ گنگا اور جمنا کے گیت۔ ہولی اور ساون کے دلفریب ناچ، اودھی، بنارسی، جونپوری ٹھمریاں۔ دادرے اور دوہے، "رتن کٹوری گھی جلے، چوہے جلے کسار، گھونگٹ میں گوری جلے جائے مور کدہ وبرنار"۔ راجپوتانے کے جنگی ترانے، "تن تلواراں۔ لچھیا، تل تل او یہ سیبو، آلاں گھاواں اور ٹسی بچن یاک ٹھہر نقیب"۔ پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے کشمیری گیت، "لچ پُھلے اندو نن چہ کنن گو ژے نامے اون"۔ اُفق کے اُس پار سے آتی ہوئی بنگالی گیتوں کی پُر سوز تانیں، "مانجھی ما یہ پار سے پار سے او دیدی، ٹھو نار بندھو گان گورے جائے"۔ خوددار آفریدیوں کے آتشیں ترانے۔ "تو تان پا شو پا خو ہمانے تورے، نہ دسرکار دروٹی پرواہ نہ لرم!" ہندوستان کی سب سے قدیم اور عجیب و غریب زبان نیپالی گو کے گیت ———

اَنتنتا دیہمُوال الٹا ویلگو۔
البٹرری چند ماماجاگ ماتا ویلگوُ
اِنتنتا ویمُوسیڈ الکا ویلگو
اِنتنتا ما آبائی ماکٹرلا ویلگوُ۔

بنگال کا "جاری" نرت، گجرات کا "گربا" آسام کا "بہو" ناچ۔

گیتوں کی فائلوں کے انبار میں گھرا ہوا جہاں گرد ایک ایک گیت کا جائزہ لیتا ہے۔ ترجمہ کے مسودے کو گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ بار بار اُسے شک گزرتا ہے۔ کہ اس نے گیت کا ترجمہ نہیں کیا بکہ قتل کر ڈالا ہے۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوتا۔ ایک ایک لفظ کا صحیح بدل ڈھونڈھ نکالنے کے لئے دو گھنٹوں کھو جاتا ہے۔

رات ڈھل چکی ہے۔ کائنات پر سکوت اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ پڑوسی خراٹے لے رہے ہیں۔ ہمسائے کی گھڑی تین بجاتی ہے۔ لیکن گیتوں کے رسیا کو نیند کہاں؟ یہ کام رات کی خاموشی میں ہی ہو سکتا ہے۔ دن میں تو اسے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ افسانے لکھنے ہیں۔ ریڈیو سٹیشن جانا ہے۔ پروف دیکھنے ہیں۔ نہیں وہ ابھی نہیں سوئے گا۔ چار بجے تک اُسے اس مرہٹی گیت کا ترجمہ کر لینا چاہئے.... ترجمہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اُس گیت کے بول گنگنانے لگتا ہے۔ اس کے دماغ میں ہزاروں گیتوں کے سُر تال گونج اُٹھتے ہیں۔ معاً وہ اپنے ماحول کو بھول جاتا ہے۔ زمین پر پڑی ہوئی چٹائی ہوا میں اُڑنے لگتی ہے۔ اور وہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا چاند اور ستاروں کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ فضاؤں میں دلکش اور روح پرور نغمے حوروں کی لوریوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ یہی جہاں گرد کی اصلی دنیا ہے۔ کوئی قفس کوئی آشیانہ اسے قید

نہیں رکھ سکتا۔ وہ جہاں گرد ہے اور جہاں گرد ہی رہے گا!"

فریادی

"مجموعۂ اضداد ہے! رازِ سربستہ ہے! داماندۂ راہرو ہے! سو فیصدی پرولتاری ہے! دو سو فیصدی بورژوا ہے۔ سوالیہ نشان ہے؟ المیہ نظم ہے۔ سراسر رومانی ہے۔ یکسر قنوطی ہے نوحۂ کشمیر ہے! نالۂ یتیم ہے!!! لارنس عربی کے بعد دوسرا پُراسرار شخص ہے۔ آزاد اور ظفر علی خاں کے بعد تیسرا خطیب ہے" —— یہ ہیں مختلف رائیں جن کا اظہار کرشن چندر کی شخصیت کے متعلق کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بیچارہ کرشن چندر ابوالہول کی پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ میری دانست میں کرشن چندر سیدھا سادا انسان ہے۔ اُسکی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اُسے ہر خوبصورت عورت "اپنا بھائی" اور ہر بدصورت لڑکی "اپنا عاشق" تصور کرلیتی ہے۔ مجموعۂ اضداد وہ صرف اس حد تک ہے کہ اُس کی آنکھیں کشمیری، زبان پنجابی، اور لباس یورپین ہے۔ اور طبعاً و عملاً وہ بورژوا لیکن قولاً و تحریراً

بردلشاری ہے۔ البتہ ایک اعتبار سے وہ عجیب و غریب ادیب ہے۔ نومبر ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کہ لاہور میں اچانک اس نے خودکشی کر لی لیکن ایک سال بعد دہلی میں زندہ ہوگیا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ میں اس کی دوسری وفات ہوئی۔ لیکن عدم آباد پہنچنے کی بجائے وہ پونا پہنچ گیا۔ اس وقت بمبئی میں ہے اور ابھی تک زندہ ہے شاید اب کبھی نہیں مرے گا۔

فطرتاً وہ تلون کیش ہے۔ ہر تیسرے سال کے بعد ایک نئے امام کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ لڑکپن میں اس کا امام ڈان جوآن تھا۔ جوانی میں احمد شاہ بخاری چند دنوں کے لئے وہ ڈبلیو زیڈ احمد پر ایمان لے آیا۔ اور آج کل اس کا امام دیوکارانی ہے۔ ایک ہی قسم کے قدرتی نظاروں، نسوانی جمالوں اور ادبی تجربوں سے وہ دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ سری نگر سے پہلگام جاتے ہوئے کشمیری جھرنوں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور گنگناتے ہوئے پہاڑی نالوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن جلد ہی ان سب کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ "ہم بھی کتنے بے وقوف ہیں"۔ وہ لاری میں بیٹھے ہوئے کہتا ہے۔ "کہ ان آبشاروں کے مسلسل اور بے معنی شور میں موسیقی تلاش کر رہے ہیں۔" پہلگام میں وہ چار دن رہنے کے بعد اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اور وہ بار بار یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ "خیال کرو صرف وہ چار اونس صاف آکسیجن کیلئے ہم اس ویرانے میں آبسے ہیں۔ اپنے افسانوی مجموعوں کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں کبھی چمک پیدا نہیں ہوتی بیں نے اسے کبھی اپنے افسانے

کی تعریف کرتے نہیں سُنا۔ دراصل وہ گذشتہ تجربوں سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے۔ اور نئے نئے تجربوں کی دھن میں اپنا بہت کچھ پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

پہلی ملاقات میں اُس کے مداحوں کو اس سے ملکر اکثر مایوسی ہو جاتی ہے۔ میانہ قد گندمی رنگ اور جواں سال۔ وہ اگر کالج کا چھوکرا نہیں تو زیادہ سے زیادہ سول سیکرٹریٹ کا کلرک دکھائی دیتا ہے۔ عام ہندوستانیوں کی طرح اُسے باتیں بنانے کا شوق نہیں آپ اُس سے گھنٹوں باتیں کئے جائیں۔ وہ چپ چاپ خاموش مبہوت بنا بیٹھا رہے گا۔ یا آپ کا جی رکھنے کے لئے کبھی کبھی مسکرا دے گا۔ اُس کی مسکراہٹ ہمیشہ ہلکی اور نرم ہوتی ہے۔ مونالزا کی طرح مسکراتے مسکراتے تھک جائیگا تو تھوکنا یا ناک صاف کرنا شروع کردے گا۔ اس کی ناک میں نقص ہے جس کی وجہ سے اُسے اکثر زکام کی شکایت رہتی ہے۔ "بدصورت عورتوں کے بعد زکام ہی وہ لعنت ہے" وہ کہا کرتا ہے۔ "جس سے میں عمر بھر پیچھا نہیں چھڑا سکا" مسکراہٹ کے علاوہ اسکی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا حزن و ملال ہے۔ ایک قسم کی ازلی و ابدی حسرت جو میں نے کشمیری بچوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔

اس سے ملنے کے بعد —— ہر شخص کو شک گذرتا ہے کہ وہ افسانے خود نہیں لکھتا بلکہ کسی سے لکھواتا ہے۔ دراصل جلوت کا کرشن چندر خلوت کے کرشن چندر سے بالکل مختلف ہے۔ جلوت میں وہ تکلف اور سنجیدگی کا نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ وہ صرف بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتا ہے۔ اور بخدا جب کھلتا ہے تو امریکن پیراشوٹ کی طرح "بے پناہ" ہو کر کھلتا ہے۔ اور اسی وقت اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ دلچسپ چوٹیں کر سکتا ہے۔ لنترانیوں کے جھگڑے چکا سکتا ہے اور دل کے پھپھولوں

اور سینہ کے داغوں کی نمائش بھی کر سکتا ہے۔ نفاست پسندی اُس کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ وہ کبھی معمولی کپڑے نہیں پہنتا۔ رذیل ہوٹل میں قیام نہیں کرتا۔ معمولی درجے میں سفر نہیں کرتا۔ اور گھٹیا قسم کی نثر نہیں لکھتا۔ اور اکثر کہتا ہے "وہ نثر ہی کیا جس کے ہر فقرہ میں مزاح کی چاشنی یا شعریت کی رنگینی نہ ہو۔" اس کی زندگی کا کوئی اصول ہے تو وہ ہے "سمجھوتہ" وہ مہاتما گاندھی کی طرح قدم قدم پر سمجھوتہ کرنے کو تیار رہے۔ وہ ان ادبا سے آنِ واحد میں سمجھوتہ کر لیتا ہے جنہیں ساری عمر کوستا رہا ہے۔ وہ ان رشتہ داروں کے ناز اُٹھانے کیلئے فوراً تیار ہو جاتا ہے جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ اس ہستی سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے جو دولے سے مشابہت رکھتی ہے۔ چند آدمیوں سے اسے ازلی بیر ہے۔ مثلاً "پنڈت، لالے، ملانیں، یا بدصورت عورتیں۔ اگر اس کا بس چلے تو انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ لیکن اس کا بس نہیں چلتا اور وہ ان سے بھی سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب وہ سرینگر کے بازاروں میں ملاّحوں کو دہی کے بڑے اور بیسن کے پکوڑے کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو غصہ سے چیخ اُٹھتا ہے "سالیاں چار سو میل کا سفر اس نعمت کو چکھنے کے لئے کرتی ہیں۔"

کرشن چندر طفلِ مکتب اور معمّر فلسفی کا دلچسپ مرکب ہے۔ لذیذ کھانا دیکھ کر بچوں کی طرح چٹخارے لینے لگتا ہے۔ ہمسایہ کو ڈرانے کے لئے پہلگام میں آدھی رات کے وقت منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجاتا ہے۔ اتنی شہرت حاصل کرنیکے باوجود اپنے نام کے ساتھ "ایم اے" کا دم چھلا لگاتا ہے۔ اس کا فلسفہ لینن اور شیلی کے فلسفہ کا امتزاج ہے۔ وہ پرانے نظام کو دھماکے سے پھٹنے والے بم سے اس طرح اُڑا دینا چاہتا ہے کہ

مزہ آجائے"۔ کائنات کو مٹھی میں اس طرح بھینچنا چاہتا ہے کہ چرمر ہو جائے۔ اسے طبقاتی نظام سے نفرت ہے۔ لاری میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے۔ لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی سوچنے لگتا ہے کہ انسان نے ہر جگہ پہلا، دوسرا، تیسرا درجہ کیوں بنا رکھا ہے۔ جماعت بندی ہمیشہ اس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے کشمیری ہانوؤں کو صاحب لوگوں کے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھ کر اُس کا خون اُبلنے لگتا ہے۔ اور جب وہ کشمیر سے متعلق رندی اور ہوسناکی کی داستانیں سنتا ہے، تو سرد آہ بھر کر کہتا ہے "کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس جنت میں فقط حور و غلمان کی تلاش کرنے آتے ہیں"۔

کشمیر سے اُسے والہانہ عشق ہے لیکن وہ کاشمیری نہیں۔ وہ صرف اسی نسبت سے کاشمیری ہے جس نسبت سے لاہوری، دہلوی، لکھنوی، پونوی یا بمبوی ہے۔ وہ نہ کشمیری بول سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے لیکن کشمیری زبان سُن کر اُس کا دل مسرت سے اُچھلنے لگتا ہے۔ "کتنے شیریں بول ہیں کشمیری زبان کے"۔ وہ حیرت سے ہانوؤں کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

کرشن چندر اچھے افسانے تب لکھتا ہے، جب پانی برس رہا ہو۔ جب وہ کسی "لالہ رُخ" کے کاشانے میں جلوہ افروز ہو۔ جب اُسے پیسوں کی سخت ضرورت ہو۔ وہ عموماً ایک نشست میں افسانہ لکھ لیتا ہے اور لکھتے وقت بہت کم الفاظ کاٹتا ہے۔ بیشتر اس کا نقشِ اول ہی نقشِ آخر ثابت ہوتا ہے۔ بسا اوقات اُس کے افسانوں کی بنیاد کوئی ذاتی حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے۔ اسے زندگی میں کافی حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک دفعہ یرقان میں سخت مبتلا ہوا۔ دو دفعہ باؤلے کُتے نے کاٹ کھایا۔ ایک بار کالج سے بھاگ گیا اور ہگلی کے پُل میں پناہ گزیں ہوا۔ ایک دفعہ پولیس

کے ڈر سے چھت پر سے چھلانگ لگا دی۔ اور متعدد بار حسین لڑکیوں سے اس لئے شادی نہ کر سکا کہ اس کے پاس موٹر کار نہ تھی۔ موٹر کار کو وہ نہایت کام کی چیز سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص سیاست یا عشق میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے پاس موٹر کار نہ ہو۔

پرائیویٹ زندگی میں کرشن چندر شمع خاموش ہے۔ جس نے یہ سمجھ کر کہ صرف چیخنے سے اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ ہر رنگ میں جلنا منظور کر لیا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ اُس فرشتے کی طرح چلاتا ہے جو عرش سے اڑ کر زمین پر اترے۔ اور حضرت انسان کی خباثت، کمینگی اور بربریت کو دیکھ کر غم و غصہ سے بلبلا اٹھے۔ انگریزی شاعر شیلی کی طرح وہ ہمیشہ آنے والی حسین دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں نوجوان لڑکیاں وحشی ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھریں۔ مزدور ہنستے گاتے نظر آئیں اور ہر عورت ہیلن آوٹرائے اور ہر محبوبہ کلوپیٹرا بنی ہوئی ہو لیکن جب زندگی میں اُسے یہ چیزیں نہیں ملتیں تو اُن کھلونوں سے دل بہلاتا ہے جو ایام طفلی سے اس کی تسکین کا باعث بنتے رہے ہیں۔ یعنی ایک عدد موٹر کار۔ چند احباب۔ ایک درجن اچھی کتابیں اور لذیذ کھانا پکانے والی معمولی خدوخال کی بیوی! ☆

کلکتے کا ذکر

لاہور سے کلکتہ کا سفر درپیش ہو تو دو ہی طریقے ہیں۔ مقدور ہو تو ہوائی جہاز میں سفر کیجئے۔ ناشتہ لاہور میں اور شام کا کھانا کلکتہ میں کھائیے۔ اور مقدور نہ ہو تو تھوڑا سا کلوروفارم جیب میں رکھ کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ جائیے۔ جونہی گاڑی روانہ ہو۔ اللہ کا نام لیکر کلوروفارم سونگھنا شروع کر دیجئے۔ جب آپ کو ہوش آئیگا۔ تو آپ اپنے آپ کو لکھنؤ کے اسٹیشن پر پائیں گے۔ ایک بار کلوروفارم پھر سونگھیئے۔ اور ہوش آنے تک بردوان پہنچ جائیے۔ بردوان سے ہوڑہ نزدیک ہے۔ اس لئے کلوروفارم کو احتیاط سے بیگ میں رکھ لیجئے۔ کہ واپسی کے وقت کام آئے۔ اگر آپ اس طریقہ پر عمل نہیں کریں گے۔ تو صبر اور انتظار کرتے کرتے چاہے آپ ختم ہو جائیں۔ سفر ختم نہیں ہوگا۔ آپ لاکھ جتن کریں۔ ہم سفروں سے گپیں ہانکیں۔ رسائل کی ورق گردانی

کریں، کلکتہ میں کو گالیاں دیں، جمائیاں لیں۔ لاحول پڑھیں۔ لیکن منزل قریب آتی نظر نہیں آئے گی۔

کلکتہ کی ہر چیز نرالی ہے۔ اس کو ہی لیجیے۔ کہ کلکتہ نام کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔ حالانکہ کلکتہ شہر میں درجنوں مقامی سٹیشن ہیں۔ کلکتہ کی گھڑیاں باقی شہروں کی گھڑیوں سے ایک گھنٹہ آگے رہتی ہیں (اسی بوالعجبی کو کلکتہ ٹائم کہتے ہیں) کلکتہ میں لوگ بیڈ منٹن بجلی کی روشنی میں کھیلتے ہیں۔ ہوٹلوں میں پانی بوتلوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ کلکتہ میں ہندوستانی فلمیں بنتی ہیں۔ جنہیں عموماً وہ لوگ ڈائرکٹ کرتے ہیں۔ جو ہندوستانی نہیں جانتے۔ کلکتہ میں "س" "ش" ہو جاتا ہے۔ ٹانگہ، گھوڑا، گاڑی اور شلوار، ساڑھی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ویسے تو کلکتہ میں ہر صوبہ اور قماش کا انسان دیکھنے میں آتا ہے لیکن سب سے دلچسپ آدمی کلکتہ کے اصلی باشندے ہیں۔ سانولے سلونے متین۔ بخل کی حد تک کفایت شعار۔ سادگی اور بھلمنساہٹ کے پتلے۔ نگاہ اولین میں بنگالی بہت بھولے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہر بنگالی وہ نہیں جو وہ نظر آتا ہے۔ در اصل ہر بنگالی کی بات میں ایک نکتہ ہوتا ہے۔ جسے صرف ایک دوسرا بنگالی ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے اُس نکتہ کو پا بھی لیں۔ تو بنگالی بابو جھٹ پینترا بدل کر ایک اور نکتہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا ہے۔ جب تک آپ چکرا کر اپنی ہار مان نہیں لیتے۔ بنگالی بابو دو طرح سے اپنے حریف کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باتیں بنا کر یا بالکل خاموش رہ کر۔ اگر وہ نوجوان ہے۔ تو بڑھ بڑھ کر باتیں کرے گا۔ اگر ادھیڑ عمر کا ہے تو فلسفیوں کے انداز میں گھنٹوں مراقبہ میں بیٹھا نظر آئے گا۔ بیشتر بنگالی

چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد مسکرانا اور ہنسنا ترک کر دیتے ہیں۔ اور اونگھنا یا بڑبڑانا شروع کرتے ہیں۔ خد و خال کے اعتبار سے بنگالی لوگ دو قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ بنگالی جن کا چہرہ فٹ بال یا رس گلا سے ملتا ہے۔ اور بنگالی جن کا چہرہ بوتل یا بیلن سے مشابہت رکھتا ہے۔

اول الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پھولے ہوئے اور موخر الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پچکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلکتہ میں حسن ملیح کی فراوانی ہے۔ اس شہر میں حسن صبیح کی تلاش کرنا صحرا میں سبزہ زار کی جستجو کرنے کے مترادف ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو رخ روشن تو کیا "بجھی ہوئی شمع" بھی کہیں نظر نہیں آئے گی۔ "بالی عمریا" "پتلی کمریا" اور "سانولی صورتیا" قدم قدم پر ملتی ہے لیکن وہ قندیلیں جن کی تجلی کے سامنے عشق کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کلکتہ کے حصہ میں نہیں آئیں۔

کلکتہ میں زندگی صرف چار محوروں کے گرد گھومتی ہے۔ روپیہ، بوتل، گھوڑا، لڑکی۔ یہاں ہر شخص روپیہ کمانے کے لئے آتا ہے۔ سوائے پنجابیوں کے جن کا شغل ہر ملک اور ہر شہر میں روپیہ خرچ کرنا ہے۔ کروڑپتی مارواڑی سیٹھ سے لیکر بنگالی رکشا کھینچنے والے تک ہر شخص کی نگاہ کسی کی جیب پر ہے۔ روپیہ کمانے کی دھن میں لوگ اس برق رفتاری سے اِدھر سے اُدھر بھاگتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی شخص کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ تاجروں اور سوداگروں سے لدی ہوئی کاریں۔ ٹرامیں۔ ٹیکسیاں کلکتہ کی سڑکوں پر جب زناٹے بھرتی ہوئی گزرتی ہیں۔ تو ایک نووارد کو یہ شک گذرتا ہے کہ وہ کلکتہ نہیں بلکہ لندن یا نیو یارک کے مضافات میں آ پہنچا ہے۔ ٹریفک کا یہ حال ہے۔ کہ سڑک کو پار کرنے کے لئے کئی دفعہ پورے تیس منٹ

انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آپ ہمت کر کے ایک یا دو گز آگے بڑھتے ہیں۔ دائیں طرف سے پچاس موٹریں اور بائیں طرف سے اتنی ہی ٹریمیں آپ کو للکار کر کہتی ہیں۔ "خبردار" اگر کوئی شخص موٹر کے نیچے آکر خودکشی کا ارادہ رکھتا ہو۔ تو اُس کے لیے کلکتہ کی سڑکیں نہایت موزوں ہیں۔

"بیوپار میں روپیہ کماؤ۔" ریس میں گھوڑوں پر داؤ لگاؤ۔ ہوٹلوں میں شراب پیو۔ اور اگر کسی طرح بھی دل نہ بہلے تو کسی سے آنکھیں لڑاؤ۔" کلکتہ میں امیر طبقہ کے یہی مشاغل ہیں۔ کلکتہ تجارت کا مرکز ہے۔ دیگر اجناس کی طرح یہاں حسن کی تجارت بھی اگر دن دونی نہیں، تو یقیناً رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس جنس کے دلال عموماً ہوٹلوں اور سینما گھروں کے گرد و نواح میں دیکھے جاتے ہیں۔ گربہ مسکین منکسر المزاج۔ مفلوک الحال یہ لوگ جو عموماً میرٹھ۔ بلند شہر اور لکھنؤ سے کلکتہ میں آتے ہیں۔ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ شریف الطبع اتنے کہ ہر راہرو سے پُوچھ لیتے ہیں۔ "صاحب چاہیئے؟" اگر آپ انہیں دھتکاریں تو بُرا ماننے کی بجائے شاعری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

"برس تیرہ کا یا چودہ کا سِن"
"ستم کی چال ستم کی ادا ستم کی نگاہ"
"ابھی نتھ بھی نہیں اُتری صاحب"

کلکتہ میں ایک مثل مشہور ہے۔ کہ اگر آپ نے کلکتہ کی ریس نہیں دیکھی۔ تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کلکتہ کی ریس واقعی عجیب تماشا ہے۔ دیوانوں کا سب سے بڑا ہجوم دیکھنا مطلوب ہو۔ تو کلکتہ کی ریس ضرور دیکھیے۔ اتنا بڑا ہجوم بڑے سے بڑے سیاسی

جلسہ یا جلوس میں بھی آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ اس ہجوم کو کہ جو تمام صوبوں کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ نہیں بلکہ اسی کروڑ ہے۔ ہر ایک شخص کے ہاتھ میں ریس کی کتاب ہے جس کا وہ اس انہماک سے مطالعہ کر رہا ہے۔ جیسے وہ نہایت دلچسپ ناول ہو۔ ایک دوسرے سے ٹپ (TIP) لئے جا رہے ہیں۔ قیاس کے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ اپنے اپنے گھوڑے کی تعریف میں قصیدے کہے جا رہے ہیں۔ یک لخت گھنٹی بجتی ہے۔ جوں جوں گھوڑے نزدیک آتے جاتے ہیں۔ تماش بین گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک باآواز بلند پکار رہا ہے۔ "بھائی صاحب۔ بھائی صاحب"۔ دوسرا زور زور سے چیخ رہا ہے۔ "بھابی جان۔ بھابی جان"۔ یہ نعرے سن کر ایک نو وارد یہی سمجھتا ہے۔ کہ بھائی صاحب بھابی جان کی معیت میں ریس کورس میں تشریف لا رہے ہیں۔ لیکن اُسے بعد کو پتہ چلتا ہے۔ کہ "بھائی صاحب" اور "بھابی جان" تو گھوڑوں کے نام ہیں۔ جب وقت فاصلہ دو ایک فرلانگ رہ جاتا ہے۔ اُس وقت ہجوم کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ جو بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو کھڑے ہیں۔ وہ ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو ناچ رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگتے ہیں۔

کلکتہ کی ریس کے بعد کلکتہ میں دوسری قابلِ دید چیز فلمی سٹوڈیوز ہیں۔ یہ تقریباً سب کے سب ٹالی گنج میں واقع ہیں۔ ٹالی گنج ہوڑہ سٹیشن سے کافی دور اور قبرستان کے کافی نزدیک ہے۔ چونکہ فلمیں بنانے والے شور و شغب اور تنقید و تبصرہ سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے سٹوڈیوز قبرستان کی بغل میں بنائے ہیں۔ ہر

ایک سٹڈیو کا ایک دربان ہوتا ہے۔ جو اردو شاعری کے روایتی دربان کی طرح بھید
مغرور اور بد دماغ ہوتا ہے۔ جب تک آپ دس بارہ دفعہ کورنش بجا نہ لائیں۔ آپ کو سٹڈیو
کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیگا۔ فلمی سٹڈیو چھوٹے پیمانے پر عجائب گھر ہوتا ہے۔
زیادہ صحیح الفاظ میں عجائب گھر اور چڑیا گھر کا مرکب ہوتا ہے۔ یہاں ہر ایک شے اور
ہر ایک شخص عجوبہ روزگار ہے۔ کلکتہ کے سٹڈیوز میں عموماً ہر ایک شخص پر کسی
دوسرے شخص کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً آپ جسے مسخرا سمجھ رہے ہیں۔ وہ مسخرا نہیں
ڈائریکٹر ہے۔ جسے آپ پنواڑی سمجھتے ہیں۔ وہ پنواڑی نہیں سیٹھ صاحب ہیں۔ جسے
آپ نے بزرگ سمجھ کر سلام کیا ہے۔ وہ بزرگ نہیں بلکہ چھوکرا ہے جس نے مصنوعی
داڑھی لگا رکھی ہے۔ جسے آپ نے ایکسٹرا لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہی دراصل
ہیروئن ہے۔ جن سرمگیں پلکوں کی آپ تعریف کر رہے ہیں۔ وہ دراصل سرمگیں
پلکیں نہیں، بلکہ نہایت معمولی پلکیں ہیں۔ جن پر ایک خاص مصالحہ لگایا گیا ہے۔
جس زلفِ دراز کی طرف آپ غور سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ دراصل مانگے کی زُلف
دراز ہے۔ بعض اوقات سٹڈیو میں ہیرو۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر میں تمیز کرنا نہایت
مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر جو شخص سب سے زیادہ شور مچائے۔ وہ ڈائریکٹر۔ جو ایکسٹرا
لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا مسکرا رہا ہو وہ ہیرو اور جو ہیروئن کے ارد گرد منڈلا رہا
ہو۔ وہ پروڈیوسر ہوتا ہے۔ ہر سٹڈیو کی طرح کلکتہ کے سٹڈیوز میں تین اصطلاحیں
کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہٹ سانگ۔ ہٹ سانگ وہ گانا ہوتا ہے۔
جسے فلم دیکھنے کے بعد کوچوان۔ ٹیکسی ڈرائیور اور اسی قماش کے لوگ گاتے ہیں۔
"فلاپ" ـــــ اس فلم کو کہتے ہیں جس کی ناکامیابی کی خبر سُنکر پروڈیوسر کے

قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔" مکھن لگانا " یعنی حد سے زیادہ چاپلوسی کرنا۔ کلکتہ کے سٹوڈیوز میں اکثر مکالمہ نویس ڈائریکٹر کو مکھن لگاتا ہے۔ ڈائریکٹر پروڈیوسر کو۔ پروڈیوسر ہیروئن کو۔ اور ہیروئن کسی کو مکھن نہیں لگاتی۔

کلکتہ میں جن چیزوں کے لئے جی ترس جاتا ہے۔ وہ ہیں کڑاکے کی سردی۔ پکی ہوئی گندم کے سنہری کھیت۔ بیلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی لٹھے کی شلواریں۔ بھرے بھرے جسم والی عورتیں۔ وزنی پنجابی گالیاں۔ کیکر اور جنڈ کے ذلیل درخت۔ اور کلکتہ سے واپس آکر جن چیزوں کی یاد مدت تک دماغ کے تہ خانوں میں رینگتی رہتی ہے۔ وہ ہیں پنجم میں گائی ہوئی کوئلیں۔ تالابوں پر لہراتے ہوئے ناریل کے سائے۔ چاندی کی طرح دمکتا ہوا ہوڑہ کا پل۔ قطب مینار کا منہ چڑاتی ہوئی سر بفلک عمارتیں۔ نرگس کو شرماتی ہوئی خوبصورت بنگالی آنکھیں۔ گھٹی گھٹی فضا۔ دبی دبی سسکیاں اور ہگلی کا غلیظ پانی! *

عورت۔ محبّت۔ زندگی۔ اِنسان

ایک نقاد کی رائے میں جس شخص نے عورت۔ محبت۔ زندگی اور اِنسان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ اگر اس سہل شرط کو پورا کرنے سے اِنسان ادیب بن سکتا ہے۔ تو کیوں نہ اِن موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے۔

عورت۔ عورت "جملہ شرطیہ" ہے یا "فعل تمنائی"۔ عورت ماں۔ بیوی یا بہن ہے۔ اور محبوبہ گلہری ہے یا مچھلی۔ شوخ اور شریر گلہری جو تعاقب کرنے والے کی بے بسی پر قہقہہ استہزا بلند کرنے کے بعد درخت کی سب سے اُونچی شاخ پر جا پہنچتی ہے۔ ایک ایسی چالاک مچھلی جو کبھی جال میں نہیں پھنستی اور اگر پھنستی ہے تو ہاتھ سے پھسل کر پانی میں جا گرتی ہے۔ عورت دبیز پردہ ہے یا سیاہ نقاب مجسم بے نیازی ہے

یا مجسم بے اعتنائی۔ عورت ارض مشرق میں صید اور ارض مغرب میں صیاد ہے۔ عورت ہندوستان میں آنسو۔ ٹرکی میں مسکراہٹ اور انگلستان میں خندہ بیباک ہے۔ عورت جب محبت کرتی ہے۔ تو ابوالہول کی پہیلی۔ نفرت کرتی ہے تو بپھری شیرنی اور حسد کرتی ہے تو کڑکتی ہوئی بجلی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مطالبہ خوشامد، سب سے بڑا رازدان آئینہ اور سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔

محبت۔ محبت پچاس فیصدی حماقت اور پچاس فیصدی تضیع اوقات ہے۔

محبت کے تین درجے ہیں۔ حماقت۔ شدید حماقت۔ اور عشق۔ محبت وہ دروازہ ہے۔ جو بیشتر اوقات پاگل خانے میں کھلتا ہے۔ محبت ایک تاجر ہے۔ جو صرف آہوں اور آنسوؤں کا بیوپار کرتا ہے۔ محبت ایک تمثیل ہے۔ جس میں صرف دو کردار ہوتے ہیں۔ اور دونوں غائیت درجہ مضحکہ خیز۔ محبت تیشہ ہے جو اتنا سادہ لوح ہے کہ پہاڑوں کو کاٹنے کی جسارت کرتا ہے۔ محبت کچا گھڑا ہے جو اپنی مضبوطی کے زعم میں چناب کے وسیع پاٹ کو خاطر میں نہیں لاتا۔

زندگی۔ کوئی شخص زندگی کو تشبیہوں اور استعاروں کی مدد کے بغیر بیان نہیں کر سکتا۔ شیخ سعدی سے لیکر شیخ چلی تک ہر ایک مفکر نے زندگی کو اسی انداز میں دیکھا اور جانچا ہے۔ میری رائے میں زندگی علی بخش حجام کا کند استرا ہے جس کے چرکوں کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ حتےٰ کہ خود علی بخش حجام بھی!

زندگی چھانگا مانگا کا اسٹیشن ہے۔ بے رونق۔ اداس خستہ حال۔ زندگی وہ سڑک ہے جس پہ چلتے چلتے کئی آدمی جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔ زندگی اس سڑک پر بھاگتا ہوا باؤلا کتا ہے۔ جو ہر راہرو کو کاٹنے کے بعد کسی تالاب میں ڈوب مرنے کی بجائے زندہ رہتا

Zindagi Sarkash Gunda

ہے۔ زندگی مصر کی شہزادی کلیوپیٹرا ہے جو ہر عاشق کی محبت کا دم ... بھرتی ہے۔ مگر جو کسی سے وفا نہیں کرتی۔ زندگی سرکش گھوڑا ہے جس پر سوار ہونے کی ہر شخص کوشش کرتا ہے۔ لیکن جو ہر شاہسوار کو زمین پر پٹخ کر ہوا ہو جاتا ہے۔ زندگی خوبصورت تیتری ہے۔ جو اپنے شوخ اور خوبصورت پر دکھا کر ہر شخص کو تعاقب کرنے پر ورغلاتی ہے۔ لیکن جو آنِ واحد میں پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی میں غائب ہو جاتی ہے۔ زندگی "علی بابا اور چالیس چوروں" کی کہانی میں وہ دروازہ ہے جس پر ہر شخص دستک دیتا ہے۔ لیکن جو اس لئے نہیں کھلتا کہ سم سم کا اسم اعظم کسی کو یاد نہیں۔ زندگی موسم برسات میں خستہ حال سرائے ہے۔ جس میں اتنے مچھر ہیں کہ مسافروں کو تمام رات سونے نہیں دیتے زندگی الجبرہ کا سوال جسے حل کرنے کے لئے عمر درکار ہے لیکن جس کا جواب صفر ہے۔ زندگی قرونِ وسطےٰ کے قاضی کا دُرّہ ہے۔ جس شخص کی پیٹھ پر پڑتا ہے۔ تڑاق سے پڑتا ہے۔ زندگی میراجی کی نظم ہے جس کے ایک سے زیادہ مطلب ہو سکتے ہیں۔ زندگی جوگی کا پٹارہ ہے جس میں ایک سے زیادہ سانپ پھنکار رہے ہیں۔ زندگی ہندوستانی مدیر کا ایڈیٹوریل ہے۔ طویل لامتناہی۔ بے معنی۔ زندگی سیکنڈ ہینڈ کار ہے جو کبھی اس تیزی سے زناٹے بھرتی ہے کہ آدمی بدحواس ہو جائے۔ اور کبھی اُس وقت تک حرکت نہیں کرتی۔ جب تک دس آدمی اس کو دھکا نہ لگائیں۔ زندگی صحرائے اعظم ہے جس میں تمباکو، شراب اور عورت تین نخلستان ہیں۔ زندگی بھڑکتا ہوا تنور ہے۔ جس میں جو چیز گرتی ہے جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ زندگی جھینگر کی ٹرٹر ہے مسلسل اور بے ہنگم۔ زندگی شریلی تصویر ہے جس کا نہ منہ ہے نہ سر۔ زندگی گنجے آدمی کی چندیا ہے۔ صاف۔ شفاف۔ بنجر۔ زندگی بند گلی ہے۔ جس میں سے نکلنے کا کوئی دروازہ

نہیں ۔ زندگی ولدل ہے جس میں ہر شخص کچھ اس طرح دھنس جاتا ہے کہ نہ خود نکل سکتا ہے ۔ نہ اُسے نکالا جا سکتا ہے ۔

انسان ۔ انسان لباس پہننے والا جانور ہے ۔ انسان اشرف المخلوقات ہے ۔ کیونکہ لومڑ سے زیادہ چالاک ۔ بھیڑیے سے زیادہ خونخوار اور اُونٹ سے زیادہ کینہ ساز ہے ۔ ڈارون کے نظریہ کے مطابق انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے ۔ اس لئے سب سے زیادہ تب چڑتا ہے جب اُسے آئینہ دکھایا جائے ۔ تہذیب و تمدن کی چکا چوند کے باوجود انسان ابھی تک کولہو کا بیل ہے ۔ جو ہزاروں میل کا چکر کاٹنے کے بعد وہاں پہنچا ہے ۔ جہاں سے چلا تھا ۔

ان چاروں موضوعات پر لکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں ۔ کہ نقاد کی رائے غلطی پر مبنی ہے ۔ کیونکہ ان پر لکھنے کے باوجود بھی انسان ادیب نہیں بن سکتا ۔

مدّاح

اٹھارھویں صدی کے علماء کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جانسن اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔ "ان بیچاروں کے لئے کیا کیا مصیبتیں ہیں! محنت شاقہ، پیشہ ورانہ رقابت۔ سرپرست کی تلاش۔ غربت اور آخر میں جیل!" جب میں ڈاکٹر جانسن کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں فوراً بیسویں صدی کے ہندوستانی ادبا کی مشکلات کا خیال آتا ہے اور میں بے اختیار پکار اٹھتا ہوں۔ "آہ بیچارے ہندوستانی ادیب! ان کے لئے کیا کیا آفتیں ہیں۔ ایڈیٹر۔ ناشر، آل انڈیا ریڈیو، تعزیرات ہند اور اصفہانی خنجر!" میں نے یہ پانچ آفتیں اس لئے نہیں گنوائیں۔ کہ پانچوں انگلیوں کی طرح یہ برابر نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس لئے کہ ڈاکٹر جانسن سے توارد منظور تھا۔ ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس فہرست میں دو اور آفتوں کا آسانی

سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہندوستانی نقاد اور ہندوستانی مدّاح!

نقّادوں کے متعلق میرا نظریہ ہے کہ حسینوں کی طرح ع

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اگر دوست نوازی پر اتر آئیں تو آپ کا موازنہ شیکسپیئر، مولیئر، برنارڈ شا سے کر ڈالیں۔ نہیں تو کم از کم آپ کو ہندوستانی موپاساں اور چیخوف بنا کر دم لیں۔ اور اگر کسی وجہ سے ناراض ہو جائیں، تو پھر جو کر گذریں تھوڑا ہے۔ بیچارے کیٹس (KEATS) کو کہہ دیں۔ کہ صاحبزادے۔ شعر گوئی ترک کرو اور کمپونڈری کا پیشہ سیکھو۔ اور شیلی (SHELLEY) کو مشورہ دیں کہ میاں کوئی کام کی بات کرو۔ خلا میں خوبصورت پر پھڑپھڑانے سے فائدہ؟ خیر نقادوں کو تو آدمی یوں بھی نظر انداز کر سکتا ہے۔ کہ ان کی پیش گوئیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں لیکن اس ساتویں آفت سے پیچھا چھڑانا معنی رکھتا ہے۔

سجّاد حیدر صاحب فرماتے ہیں۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔" میں کہتا ہوں۔ دوستوں سے میں سنبھل لوں گا۔ مجھے میرے مدّاحوں سے بچاؤ۔ خاصکر ان مدّاحوں سے جو اپنی رائے کا اظہار فقروں اور جملوں کی بجائے مسکراہٹوں اور قہقہوں میں کرتے ہیں۔ "خوب لکھتے ہیں آپ۔ ہی ہی ہی۔ کمال کرتے ہو بھئی ہا ہا ہا۔ اجی کیا بات ہے آپ کی قہ قہ قہ" اور ان سے بڑھ کر ان مدّاحوں سے جو آپ کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس پر مذمت کا گمان ہوتا ہے "صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں آپ ۔۔۔۔۔۔ ہاں ذرا زبان کی طرف تھوڑی سی توجہ اور دیجیے گا ۔۔۔۔۔ واقعی منفرد ہیں اپنے رنگ میں ۔۔۔۔۔ محاوروں کے استعمال میں ضرور احتیاط

سے کام لیجیے گا۔ ایک بار ہمت کر کے فسانۂ آزاد پڑھ ڈالیے۔ ہاں آپ نے ایک مضمون میں 'کھودا پہاڑ نکلی چوہیا' لکھا ہے 'نکلا چوہا' چاہیے تھا۔ اور ہاں قطرہ قطرہ بود دریا غلط ہے، 'قطرہ قطرہ شود دریا' درست محاورہ ہے۔ غیر معمولی فرو گذاشتیں ہیں۔ خوب لکھتے ہیں آپ۔"

اور پھر خدا اُن مداحوں سے بچائے جنہیں آپ سے غائبانہ تعارف حاصل ہے اور جن سے آپ کا تصادم کسی ادبی بزم میں یا سرِ راہ گاہے گاہے ہوتا ہے۔" اچھا صاحب آپ ہیں مسٹر کافور، میں تو سمجھتا تھا۔ ڈنڈ پیل کرارے جوان ہوں گے۔ یہ سینہ ہوگا۔ (اپنا سینہ پھلا کر) یہ بڑی بڑی مونچھیں، یہ لمبی ناک، یہ موٹی موٹی آنکھیں۔ بھرا بھرا جسم۔ توبہ! آپ تو بالکل مدقوق نظر آتے ہیں۔ بہر حال بہت مسرت ہوئی۔ آپ سے مل کر۔ تاہم ایسے مدّاح بھی برداشت کیے جا سکتے ہیں لیکن اُن مداحوں کا کیا کیا جائے جو آپ سے پہلی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

صاحب میں تو آپ کا عاشق ہوں۔ بھئی میں آپ کا قتیل ہوں۔" اور آپ اُن کی کھوناڑی شکل، لمبے لمبے دانت اور چپٹی ناک دیکھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ کہ اس رشکِ یوسف سے عشق نبھایا بھی جا سکے گا یا نہیں۔"

ان کے علاوہ وہ مدّاح ہیں جو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے آپ کی تعریف کے پُل باندھتے ہیں۔ ایک آوارہ مزاج۔ آشفتہ حال شخص جس کے چہرے سے نحوست برس رہی ہے۔ علی الصبح آپ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

"آداب عرض کافور صاحب۔"

"آداب عرض۔"

"مداخلت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ خاکسار انتہا ناگپوری ہے۔ پہلے ابتدا تخلص کرتا تھا۔ پھر کچھ عرصہ ناخدا کے نام سے کلام چھپتا رہا۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"اور خاکسار کی خوشی کا تو آپ اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ خاکسار آپ کا غائبانہ مداح ہے۔ خاکسار نے آپ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ 'ٹوٹے ہوئے تارے'، 'ہوائی قلعے'، 'المنظر'۔" "معاف کیجئے انتہا صاحب۔ میں ان میں سے کسی کتاب کا مصنف نہیں۔ اول الذکر دو کرشن چندر کی تصنیفات ہیں۔ اور موخر الذکر جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نام میاں بشیر احمد کی کوٹھی کا۔"

"اوہ معاف کیجئے۔ تو آپ شاعر ہیں۔ میں نے گذشتہ ہفتہ 'آفتاب' میں آپ کی غزل پڑھی تھی ؏

نہیں کچھ گھومتی سی آج پھر معلوم ہوتی ہے

"معاف کیجئے۔ میں شعر نہیں کہتا۔"

"اچھا تو شاید آپ مضمون لکھتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہی سمجھ لیجئے۔"

"تو بات یہ ہے کافور صاحب۔ کہ میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ وہ ہیں نا حنیف صاحب سائنگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر۔ سنا ہے آپ کے دوست ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ آپ اُن سے میری سفارش کیجئے گا؟"

"سفارش؟ کس قسم کی سفارش؟"

"دیکھئے کافور صاحب۔ حنیف صاحب نے گذشتہ ماہ میرے ساتھ سخت

ناانصافی کی۔ بات یوں ہوئی۔ کہ اجنالہ میں اُنہوں نے سانگ پبلسٹی کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ جس میں بنجر دیران آبادی نے رباعی پڑھی۔ اور خاکسار نے پچھتر اشعار کی غزل۔ اب بنجر صاحب کو تو بیس روپے ملے۔ اور خاکسار کو صرف ساڑھے سات۔ دیکھئے کافور صاحب، یہ ظلم ہے۔ اگر آٹھ آنہ فی شعر بھی دیتے تو ساڑھے سینتیس کا خاکسار حقدار تھا"۔ ۔ ۔ ۔

یا پھر یوں کہ ایک معمر آدمی اپنی نوجوان بیٹی کی معیت میں شام کے آٹھ بجے آپ کے دروازہ پر دستک دیتا ہے۔

"نمستے کافور صاحب"۔

"نمستے"۔

"مَیں ہوں رام دیال۔ آپ کے محلہ سے تھوڑی دور رہتا ہوں۔ محکمہ جنگلات میں کلرک ہوں اور یہ ہے میری بیٹی چنبیلی۔ بیٹی نمستے کرو کافور صاحب کو"۔

"نمستے"۔

"نمستے"۔

"کافور صاحب بہت دنوں سے خواہش تھی کہ آپ کے درشن کروں۔ آپ نے تو اردو میں گجب کر دیا ہے"۔

"آپ کی نوازش ہے"۔

"مَیں نے ٹریبیون میں آپ کی کتاب کا ریویو پڑھا تھا۔ کیا تھا کتاب کا نام چنبیلی بیٹی یاد ہے بھلا کچھ؟"

"شیشے پہ شوشہ"۔

ہاں ہاں شیشے پہ شوشہ۔ بھئی خوب۔ پرماتما کی قسم خوب نام ہے۔ مَیں کہتا ہوں پروفیسر صاحب آپ کو ایسا عجیب نام سُوجھا کس طرح؟"

"جی ہاں۔ بہت عجیب نام ہے۔ فرمایئے۔ مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"خدمت ودمت کچھ نہیں۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ ذرا دروازے اور روشندان بند کر دیجئے۔ بات یہ ہے کافور صاحب کہ میری لڑکی چنبیلی متواتر تین سال سے انگریزی کے پرچے میں فیل ہو رہی ہے۔ اس سال اس نے پھر امتحان دیا ہے، اور خوش قسمتی سے آپ ممتحن ہیں۔ میرا مطلب ہے اگر آپ مہربانی کریں تو......

"بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ مجھ سے جس قدر مدد ہو سکے گی کر دوں گا۔"

"شکریہ شکریہ۔ اچھا کافور صاحب اگر آپ کے پاس "شیشے کا شوشہ" کی ایک آدھ کاپی ہو تو مجھے عنایت فرمایئں۔ آج کل میرے پاس فالتو وقت ہے......"

مداحوں کی آخری قسم اُن لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو وقت بے وقت آپ کو مضامین کے عنوانات اور مواد مہیّا کرتے ہیں۔ "کافور صاحب آپ نے خوانچہ والوں پر کچھ نہیں لکھا کافور صاحب آپ جمعداروں پر کیوں مضمون نہیں لکھتے، دیکھئے مَیں آپ کو ایک دلچسپ بات سُناتا ہوں۔ میری چھوٹی لڑکی اُس کی عمر چار سال ہے۔ مگلر کو کھفلر کہتی ہے۔ ہی ہی ہی۔ اس پر ضرور کچھ لکھئے۔ اور میرا چھوٹا لڑکا ریڈیو کو لیڈیو کہتا ہے۔ ہاہاہا۔ بھئی خوب۔ لیجئے آپ کو ایک مضمون کا مواد مل گیا۔"

"صاحب اُس دن عجیب مضحکہ خیز واقعہ پیش آیا۔ دیکھئے کافور صاحب اس کا ذکر ضرور کسی مضمون میں کیجئے۔ مَیں اسٹیشن پہ ذرا دیر سے پہنچا۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی ——

لپک کر زنانہ ڈبہ میں جا بیٹھا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے۔ تو لگا عورتوں کی طرف دیکھنے۔ ایک عورت نے چلّا کر کہا۔ "بھئی یہ تو زنانہ ڈبہ ہے"۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ "محترمہ مجھ میں آپ کو کونسا مردانہ پن نظر آیا۔ ہی ہی ہی۔ وہ عورت کباب ہو گئی"۔

"کافور صاحب۔ اُس دن میں اور جمیل صاحب ایک مُغنیہ کے ہاں گانا سُننے گئے۔ اتفاق سے بائی جی کی طبیعت ناساز تھی۔ بالاخانہ میں بائی جی کی بوڑھی خالہ بیٹھی تھیں۔ جمیل کو جو شرارت سوجھی۔ کہنے لگا۔ بڑی بی آج تم ہی کوئی چیز سُناؤ۔ وہ بوڑھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا میں کیا گاؤں گی اس عمر میں۔ دو ایک روز میں تمہاری بہن رو بصحت ہو جائیں گی۔ پھر سارے ارمان نکال لینا۔ ہاہاہا"۔

کافور صاحب اِس پہ ایک مضمون ضرور لکھئے گا۔

اور بیچارے کافور صاحب سر جھکا کر جواب دیتے ہیں۔ "لکھیں گے۔ صاحب ضرور لکھیں گے!"

تعاقب

آج کل ایک شخص نہایت مستعدی سے میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کافی ہاؤس میں، سرِ راہ، کسی محفل میں۔ جہاں کہیں میرا اُس کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ وہ چھوٹتے ہی مجھ سے ایک سوال کرتا ہے۔ "صاحب! آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے"؟ بظاہر سیدھا سادہ سوال ہے جس کا جواب دینا مشکل نہیں۔ لیکن جس شخص نے پریم چند کا کوئی ناول نہ پڑھا، اُس کے لیے کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دنوں پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پر میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ عنوان تھا "پریم چند بحیثیت ناولسٹ"۔ یہ مقالہ بے حد سراہا گیا۔ صاحبِ صدر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پریم چند پہ ایسا پُرمغز مقالہ اُردو زبان میں لکھا گیا ہے نہ لکھا جائے گا۔ اور بہت حد تک۔ گو غیر شعوری طور پر ہی۔ صاحبِ صدر حق بجانب تھے۔ کیونکہ میں نے سارے

کا سارا مقالہ ایک انگریزی کتاب سے جو کسی جب۔ یہ نقاد نے او ہنری
(O. HENRY.) پر لکھی تھی۔ چرایا تھا۔ البتہ اس میں تھوڑا سا ردّ و بدل ضرور کر دیا تھا یعنی جہاں جہاں او ہنری کا نام آتا تھا۔ وہاں "پریم چند" لکھ دیا تھا۔ اس جلسے کے اختتام پر یہ شخص مجھے ملا۔ اور مجھے مبارک باد دینے کے بعد اُس نے کہا۔ "میں پچھلے پندرہ برس سے پریم چند پر ایک کتاب لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں میں اس موضوع پر آپ سے مفصل بحث کرنا چاہتا ہوں"۔ رسمی طور پر میں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔ "بڑے شوق سے۔ آپ کبھی غریب خانہ پر تشریف لے آئیے"۔ لیکن جب کچھ دنوں کے بعد۔ وہ واقعی میرے مکان پر آ دھمکا، تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پریم چند کا کوئی ناول شروع سے آخر تک نہیں پڑھا۔ کسی کا دیباچہ دیکھا ہے کسی کا پہلا باب پڑھا ہے کسی کا آخری۔ خیر اُس دن تو میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے آج زکام ہے، اور جب زکام ہو، تو اچھی چیز بھی بُری لگتی ہے۔ چاہے وہ پریم چند کی کہانی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب اتوار کے دن وہ پھر نمودار ہوا۔ تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں میں نے اُسے ادھر اُدھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ پوچھا۔ "آپ کو ولائتی شلغم پسند ہیں یا دیسی۔ آپ کو پتنگ بازی سے شغف ہے یا بٹیر بازی سے۔ آپ کی پتلون نئی ہے یا سیکنڈ ہینڈ؟" لیکن وہ کم بخت ہر تیسرے منٹ کے بعد اپنا سوال دُہرا دیتا۔ "آپ نے نہیں بتایا۔ کہ آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟" آخر ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ "مجھے پریم چند کے تمام ناول پسند ہیں"۔ اُس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر تمام ناول شاہکار تو ہو نہیں سکتے"۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے خیال میں پریم چند کا کونسا ناول شاہکار کا درجہ رکھتا ہے؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا یا۔ میں نے آہستہ سے کہا: "چوگانِ ہستی" فرمانے لگے: "کیوں پسند ہے؟" میں نے چہرے پر متانت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا: "دیکھئے یہ ناول سب شریف آدمیوں کو پسند ہے۔ ممکن ہے، آپ کو پسند نہ ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا نہ لگے۔"

"چھوڑیئے اس بات کو۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ "یہ بتایئے کہ اس ناول میں آپ کو کونسا کردار پسند ہے؟"

"ہیرو کا۔"

"ہیرو کے علاوہ؟"

"ہیروئن کا۔"

"ہیروئن کے علاوہ؟"

"ہیروئن کے علاوہ مجھے کوئی کردار پسند نہیں۔"

"وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ جتنے کردار ہیں، مَیں اُنہیں کردار ہی نہیں سمجھتا۔"

"آپ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟"

"گھسیارے۔"

خوش قسمتی سے اس موقع پر ایک دوست تشریف لے آئے اور مَیں نے اُن سے معذرت چاہی۔ چند دن آرام سے گزرے۔ اس کے بعد وہ تشریف لے آئے

اور کہنے لگے: "اُس دن آپ کے جوابات کچھ اس قدر مبہم اور غیر واضح تھے۔ کہ میری تسلی نہیں ہوئی، آج مجھے تفصیلاً بتایئے۔ کہ آپ چوگانِ ہستی کو کیوں شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔" میں نے چوگانِ ہستی کی شان میں چند رسمی تعریفی کلمات کہے۔ "دیکھئے۔ اس ناول میں پریم چند نے زندگی کی عکاسی کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ شیکسپیئر سے بھی بلند نظر آتا ہے۔ کردار سازی میں وہ فیلڈنگ، سکاٹ، جیمز جائس سے بھی بازی لے گیا ہے۔ اسلوبِ بیان میں وہ ہمیں ٹامس ہارڈی، میریڈتھ اور ورجینیا وُلف کی یاد دلاتا ہے۔ دو ایک ابواب میں اُس نے چارلس ڈکنز، تھیکرے، مولیاں اور میکسم گورکی سے ٹکر لی ہے۔" اُس نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا: "مثلاً کونسے باب ہیں؟" میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے جواب دیا: "میرے خیال میں آخری باب میں، یا شاید پہلے باب میں" اُس نے چوگانِ ہستی کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ اور کہا: "آپ وثوق سے فرمایئے پہلے باب میں یا آخری باب میں؟ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور جلدی سے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا۔ اس وقت مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ میری خالہ کا بھائی فرنٹیئر میل سے آ رہا ہے۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لایئے۔" ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر مجھے میرے گھر پر ملا۔ اُس دن میں نے جھوٹ موٹ عدیم الفرصتی کا بہانہ پیش کیا۔ "مجھے آج ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ بھینس بیمار ہے۔ اسے ہسپتال لے جانا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لئے بہتر صفحات کا ایک فیچر لکھنا ہے۔ بچوں کے لئے ایک خرگوش خریدنا ہے۔"

اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔ میں پرسوں حاضر ہوں گا۔"

"پرسوں نہ آیئے گا۔ مَیں راولپنڈی جا رہا ہوں"۔

"بہت اچھا۔ اتوار کو سہی"۔

"دیکھئے اتوار کو میرے بھتیجے کی شادی ہے۔ اُس دن تشریف نہ لایئے گا"۔

"سوموار آ جاؤں؟"

"میرے ایک عزیز دوست سخت بیمار ہیں۔ شاید وہ سوموار کو چل بسیں۔ اس لئے آپ سوموار کو نہ آیئے گا"۔

"منگلوار کو آ سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں منگلوار کو ضرور آیئے گا لیکن شام کو"۔

منگلوار کی شام کو مَیں ایک دوست کے گھر چُھپ کر بیٹھا رہا۔ اور اس طرح اُس دن یہ بلا ٹل گئی۔ چند دِنوں کے بعد اُس نے مجھے کافی ہاؤس میں آ دبوچا۔ اور پوچھا۔ "گئودان اور چوگان ہستی میں آپ کس ناول کو ترجیح دیتے ہیں"۔ مَیں نے کہا۔ "گئودان منشی جی کا آخری ناول ہے۔ اس لحاظ سے مَیں اُسے چوگان ہستی سے بہتر سمجھتا ہوں"۔

"یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں"۔

"معقول وجہ کیوں نہیں۔ آخر جو ڈرامے شیکسپیئر نے آخری دِنوں میں لکھے اُنہیں ہمیشہ اُن ڈراموں پر ترجیح دی جاتی ہے جو اُس نے اوائل عمر میں لکھے"۔

"لیکن اُس سے آپ یہ کلیہ گھڑ سکتے ہیں کہ مصنف کی آخری تصنیف اُس کی پہلی تصانیف سے بہتر ہوتی ہے"۔

"کیوں نہیں"۔

"آپ کس اعتبار سے "گئو دان" کو "چوگان ہستی" سے بہتر سمجھتے ہیں؟"

"اِس لئے کہ ..... اِس لئے کہ ..... اس کا اختتام بہتر ہے۔"

"کس لحاظ سے؟"

"اِس لحاظ سے کہ جب ہم گئو دان پڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِس کا وہی اختتام ہونا چاہیئے تھا۔ جو ہے۔"

اُس کی تسلّی نہ ہوئی۔ اور اُس نے پھر کبھی دِن اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے مجھ سے وقت مانگا۔ اُس دِن کے بعد وہ کئی دِن میرے مکان پر آیا۔ اور مَیں نے ہر بار اندر سے کہلوا بھیجا کہ مَیں گھر پہ نہیں ہوں۔ آج کل وہ میرے مکان پہ نہیں آتا۔ لیکن جہاں کہیں مجھ سے ملتا ہے۔ پوچھتا ہے۔ "آپ نے تفصیل سے نہیں بتایا کہ آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟" اور مَیں جھٹ یہ کہہ کر "اس وقت مجھے ذرا جلدی ہے۔ پھر عرض کروں گا"! کنّی کاٹ جاتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں کبھی وہ میرے شہر چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ اُس سے ایک دِن صاف صاف کہہ دوں کہ مَیں نے پریم چند کا کوئی ناول نہیں پڑھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں اُس مقالے کا کیا بنے گا۔ جو مَیں نے پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پہ پڑھا تھا؛

عُمر یُوں گزرتی گئی

گُذرنے کو تو عُمر گذر رہی ہے اور گذر جائے گی۔ لیکن کچھ اس انداز سے کہ کہتے ہی بنتی ہے۔ ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پونے دس بجے بستر سے اُٹھے۔ دس بجے کالج پہنچنا ہے۔ اس پندرہ منٹ کے مختصر وقفہ میں کیا کچھ کرنا ہے۔ ڈاڑھی مونڈنا، منہ ہاتھ دھوتا۔ اخبار کی سُرخیوں پر نظر دوڑاتا۔ دس بارہ مشکل الفاظ کے معنی لغات میں دیکھنا۔ ناشتہ کرنا کپڑے پہننا۔ ظاہر ہے۔ یہ تمام کام پندرہ منٹ میں نہیں کئے جا سکتے۔ جب تک انہیں بیک وقت نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک ہاتھ سے منہ میں لقمہ ڈال رہے ہیں۔ دُوسرے سے لغات کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ لقمہ مُنہ میں پہنچ جاتا ہے۔ تو خالی ہاتھ

جراب پہنانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ بایاں ہاتھ بالوں میں کنگھی کر رہا ہے۔ اور دایاں ٹائی کی گرہ لگا رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح تیاری کا مرحلہ ختم ہوا۔ اب سڑک پر ہیں۔ تیز تیز قدم اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن آوازوں کا ہجوم ہے۔ کہ تعاقب کر رہا ہے۔

"پروفیسر صاحب۔ میرا لڑکا"..... جی ہاں میں اس کے نمبر بڑھا دونگا۔"

"پروفیسر صاحب میری لڑکی"....."جی ہاں۔ وہ پاس ہو جائے گی"۔

"پروفیسر صاحب میرا ایل"....."جی ہاں۔ یکم کو ادا کر دوں گا"۔

ہانپتے کانپتے کمرے میں پہنچے۔ وہ شور ہے۔ کہ کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ گرج کر دو تین بار "خاموش" "خاموش" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ لیکن آواز صدا بصحرا بن کر رہ جاتی ہے۔ الٰہی یہ کمرہ ہے یا نقار خانہ۔ آخر تنگ آ کر میز پر زور سے مکے مارنا شروع کر دیتے ہیں:"حضرات! خاموش۔ آخر ایسی بد تمیزی بھی کیا۔ جب ہم طالب علم تھے تو اس قسم کی بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے جیکل کشور تم میری درخواست کے باوجود شور مچا رہے ہو۔ نکل جاؤ، کمرے سے باہر"۔

یک لخت کمرے میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پچھلے بینچ سے ایک لڑکا سیٹی بجاتا ہے۔ ساری جماعت کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔

"کون ہے یہ بدتمیز۔ ضرور جے کشن ہوگا۔ جے کشن فوراً کمرے سے باہر نکل جاؤ"۔ چند سیکنڈ خاموشی۔ تیسرے بینچ پر ایک لڑکا سرگوشی کے انداز میں اپنے ہمسائے سے کہتا ہے۔"معلوم ہوتا ہے۔ آج بیوی سے لڑائی ہوئی ہے"۔ پھبتی

سن کر خون کھولنے لگتا ہے۔ لیکن دانت پیس کر رہ جاتے ہیں۔ اب حاضری لی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے شور وغل کے درمیان حاضری ختم ہوئی۔ رجسٹر سے نگاہیں اُٹھیں۔

ارے یہ کیا۔ آدھی سے زیادہ جماعت غائب ہو چکی ہے۔ اچھا ہم دوبارہ حاضری لیتے ہیں۔ اب ایک ایک کر کے بھاگنے والے مختلف دروازوں اور کھڑکیوں سے داخل ہو رہے ہیں۔

"تم کہاں تھے نند لال؟"

"جی سائیکل کو تالا لگانے گیا تھا"۔

"اور تم روی شنکر؟"

"جی ذرا آب و ہوا تبدیل کرنے کے لئے باہر گیا تھا"۔

"تم دونوں بکتے ہو۔ مَیں تمہیں پانچ پانچ روپے جرمانہ کرتا ہُوں"۔

"حضرات اب کتابیں کھولئے۔ آج کا سبق نہایت اہم ہے۔ یہ ایک نظم ہے جسے ملٹن نے لکھا۔ ملٹن انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ شاعری میں اُس کا جواب نہیں۔ ملٹن کے متعلق ایک نقّاد لکھتا ہے کہ . . . . .

"میاؤں۔ میاؤں"۔

ساری جماعت قہقہہ لگا کر ہنستی ہے۔ "کون ہے یہ نامعقول۔ حضرات میں ایسی حرکات سخت ناپسند کرتا ہوں . . . . ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا۔ کہ وہ نقّاد لکھتا ہے۔ کہ ملٹن انگلستان کا سب سے بڑا زاہد تھا۔

ایک آواز۔ سُنا ہے۔ اُس نے تین شادیاں کی تھیں۔

(قہقہہ)

"ملٹن اِس نظم میں شکایت کرتا ہے، کہ خدا نے اُسے شاعری کا ملکہ عطا کرنے کے بعد آنکھوں سے محروم کیوں کیا"۔

ایک آواز۔ شاید خُدا اُسے سزا دینا چاہتا تھا۔

"کس جُرم کی سزا؟"

"غیر دلچسپ نظمیں لکھنے کی"۔

"خاموش۔ اتنے بڑے شاعر کی توہین کرتے شرم نہیں آتی"۔

"تمہید ختم ہوئی۔ اب نظم کی طرف آیئے"۔

"جی، نظم کل پڑھایئے گا۔ ہم تھک گئے ہیں"۔

"بہت نازک مزاج ہیں آپ۔ ابھی تو گھنٹی بجے دس منٹ بھی نہیں ہوئے"۔

"جی۔ باقی وقت میں باتیں کریں گے"۔

"کیسی باتیں؟"

"وصلِ یار کی"۔

"جی اپنا کوئی معاشقہ سُنایئے"۔

"خاموش"۔

"جی کوئی شعر سُنایئے"۔

"جی آپ نے "چُلبلی معشوقہ" دیکھی؟"

"مَیں ایسی بیہودہ فلمیں نہیں دیکھتا"۔

"اچھا جی۔ تو پھر چھُٹی ہی دے دیجئے"۔

"چھٹّی۔ اگر پرنسپل صاحب کو پتہ چل گیا تو؟"

"جی، پرنسپل صاحب تو خود چھُٹّی پر ہیں"۔

"اچھا تم جا سکتے ہو"۔

چیخوں، قہقہوں، نعروں کے درمیان جماعت باہر چلی جاتی ہے۔ ابھی دُوسری گھنٹی میں بیس منٹ باقی ہیں۔ یہ وقت سٹاف روم میں گذارا جاتا ہے۔ جہاں گپ شپ اُڑتی ہے۔ باتیں بنانے کے علاوہ ایک دوسرے کو بنایا جاتا ہے۔

"کیئے پروفیسر صاحب۔ بہت دُبلے ہو رہے ہیں۔ آج کل ٹیوشنز (TUITIONS) کا زور ہے"۔ "کچھ سنا بھئی۔ مجھے اس سال بھی "ترقی" نہیں ملے گی"۔ "تمہارے پاس یار بدہضمی کا نسخہ تھا۔ مجھے پرسوں سے کھٹّے ڈکار آرہے ہیں"۔ "وہ پڑھی آپ نے لاکی کی نئی کتاب۔ خوب لکھتا ہے ظالم"۔ "یار "پرچوں" نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ کم بخت ختم ہونے میں نہیں آتے"۔ "سُنا ہے تم پر پرنسپل صاحب بہت مہربان ہیں۔ کل مُسکرا کر بات کر رہے تھے"۔ "یار یہ پتلون تو دھلوا لو۔ بہت میلی ہو رہی ہے"۔ "سُنا آپ نے پروفیسر رام گوپال کو دِق ہو گئی ہے"۔

دوسری گھنٹی بجتی ہے سب پروفیسر رجسٹر اُٹھائے۔ سر جھکائے۔ اپنے اپنے کمروں کو چل دیتے ہیں۔ اب مجھے سیکنڈ ایئر کو پڑھانا ہے۔ یہ جماعت پہلی جماعت سے کہیں زیادہ شریر ہے۔ حاضری لینے کے لئے رجسٹر کھولتے ہیں۔ لیکن طلبا ہیں۔ کہ بے تحاشا ہنسے جا رہے ہیں۔ بات کیا ہے۔ یہ بار بار تختہ سیاہ کی طرف کیوں دیکھتے

ہیں۔ یک لخت تختہ سیاہ کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ اپنا کارٹون دیکھ کر جھینپ کر رہ جاتے ہیں۔ اور خفت چھپانے کے لئے جلدی سے حاضری لینے لگتے ہیں۔

"یش پال"

"تمام جماعت بیک آواز پکارتی ہے "یس سر"

"ادم پرکاش"

ایک لڑکا پوری طاقت سے چلا کر کہتا ہے "نو سر"

"دینا ناتھ"

ایک آواز۔ "جے ہند"

دوسری آواز۔ "بندے ماترم"

تمام جماعت۔ "ست سری اکال"

جھٹ رجسٹر بند کر دیتے ہیں۔ اور لال لال آنکھیں دکھا کر تقریر کرنے لگتے ہیں۔

"حضرات۔ آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ مجلسی آداب آپ کو چھو تک نہیں گئے۔ آپ "آزادی۔ آزادی" کی رٹ لگاتے ہیں۔ کیا اس منہ سے آزادی لیں گے۔ آزادی اور ڈسپلن لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزوں کی طرف دیکھئے، روسیوں کی طرف دیکھئے۔ میں کہتا ہوں۔ جاپانیوں کی طرف ......

ایک آواز۔ "قومی نعرہ"

ساری جماعت۔ "انقلاب زندہ باد"

"حضرات۔ اگر آپ انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ تو پہلے اپنے آپ میں لایئے"

ایک آواز۔ "آپ بھی ٹائی اُتار دیجئے"۔

(قہقہہ)

اچھا۔کتابیں نکالئے۔ آج مَیں آپ کو انگلستان کے مشہور شاعر جان کیٹس کے حالات زندگی بتاؤں گا۔کیٹس کے متعلق نہایت عالمانہ تقریر کرتے ہیں۔لیکن لڑکے بدستور سرگوشیاں کر رہے ہیں۔کچھ جمائیاں لے رہے ہیں۔ چند ایک مزے سے چلغوزے کھا رہے ہیں۔ باقی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"حضرات بیس برس کی عمر میں کیٹس کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا"۔ عشق کا ذکر سنتے ہی ساری جماعت چوکنی ہو جاتی ہے"۔ اس لڑکی کا نام فینی بران تھا۔کیٹس نے اُسے چند خطوط لکھے"۔

ایک آواز۔ "اجی وہ خطوط ہمیں بھی سنائیے"۔

دُوسری آواز۔ "کہ بوقت ضرورت کام آئیں"۔

طلبا کے اصرار پر کیٹس کا ایک خط پڑھ کر سناتے ہیں۔

آوازیں۔ "ہائے کیا چلبلا چٹپٹا خط ہے"۔

"ظالم نے مار ڈالا"۔

"عشق نے غالبؔ نکما کر دیا"۔

"ہائے فینی بران"۔

گھنٹی بجتی ہے۔ لڑکے "جان کیٹس زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔اِسی انداز سے باقی تین پیریڈ پڑھا کر چار بجے گھر لوٹتے ہیں۔ دماغ تھک

کر چُور ہو چکا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر سو جائیں۔ یک لخت کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"پروفیسر صاحب۔ مجھے ایک سارٹیفکیٹ چاہیئے"۔

جی کڑا کر کے سارٹیفکیٹ لکھ دیتے ہیں۔ دروازہ بند کر کے لیٹنے کی تیاری کرتے ہیں۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔

"کون ہے"۔

"جی مَیں ہوں رام گوپال"۔

دروازہ کھولتے ہیں۔ رام گوپال گڑگڑا کر کہتا ہے "پروفیسر صاحب۔ خدا کے لیئے میرا جرمانہ معاف کر دیجئے۔ ورنہ میرا باپ مجھے گھر سے نکال دے گا"۔

ایک طویل تکرار کے بعد جرمانہ معاف کر دیتے ہیں۔

کھٹ کھٹ کھٹ

پھر دروازہ کھولتے ہیں۔ ایک لڑکا سہما اور گھبرایا ہُوا ہاتھ میں انگریزی کا پرچہ تھامے ہُوئے نظر آتا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ پکار کر کہتا ہے۔

"پروفیسر صاحب۔ مجھے پانچ نمبر اور دے دیجئے۔ ورنہ مَیں تباہ ہو جاؤں گا"۔

دو گھنٹے اس بات پر بحث ہوتی رہی۔ کہ امتحان میں اُس کی ناکامیابی کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے یا اُس پر۔ دماغ پہلے سے کہیں زیادہ تھک جاتا ہے۔ غشی کی حالت طاری ہُوا چاہتی ہے کہ کالج کا چپڑاسی دروازے پر دستک

دیتا ہے "جناب آپ کو پرنسپل صاحب یاد فرماتے ہیں"

پرنسپل صاحب سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سُناتے۔ وہی پُرانے شکوے "آپ روزانہ لیٹ کیوں آتے ہیں؟ آپ کی جماعت اتنا شور کیوں مچاتی ہے۔ آپ نے کل پانچواں پیریڈ کیوں نہیں لیا؟ آپ کھیلوں میں حصّہ کیوں نہیں لیتے؟ یونیورسٹی کے امتحان میں آپ کی جماعت کا نتیجہ ہر سال کیوں "خراب" رہتا ہے؟

الغرض ایسی باتیں جنہیں سُنکر کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ ہم زیر لب ایک شعر گنگناتے ہیں ؎

چُپ رہے ہم ادب سے محشر میں
ورنہ کس بات کا جواب نہ تھا

اور مجرموں کی طرح سر جُھکائے کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔

گذرنے کو تو عمر گذر رہی ہے اور گذر جائے گی۔ لیکن اِس انداز سے کہ کہتے ہی بنتی ہے۔ ؎

ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے ہیں

خودکشی

آخر اُس نے خودکشی کر لی۔ کیا اُسے کسی سے عشق تھا؟ کیا وہ گھوڑ دوڑ میں روپیہ ہار گیا تھا؟ کیا وہ مقروض تھا؟ نہیں۔ اُسے صرف زکام کی شکایت تھی! بس اتنی سی بات پر! اُتنا بزدل!

نہیں صاحب وہ بزدل نہیں تھا۔ جو شخص متواتر پندرہ دن سونف کا جوشاندہ پی سکتا ہے۔ ایک ماہ خشخاش اور بنفشہ کا شربت زہر مار کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ ماہ عناب بنفشہ اور ادرک کی چٹنی کھا سکتا ہے۔ وہ وکٹوریہ کراس کا مستحق ہو نہ ہو۔ بزدل نہیں ہو سکتا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اُسے صبح و شام اس شدت سے چھینکیں آتی تھیں کہ وہ چھینکتے چھینکتے بدحواس ہو جاتا تا۔ اُس نے دوستوں سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا۔ وہ اُلٹا اُسے بنانے لگے۔ "ارے میاں۔ یہ بھی کوئی مرض ہے۔ کالی کھانسی

نہ تپ دق۔ محض زکام۔ جب اُس نے اصرار کیا کہ زکام اِتنا ہی اذیت بخش مرض ہے، جتنا کہ تپ محرقہ۔ تو کسی دوست نے کہا۔ فاقہ کرو۔ کوئی بولا۔ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ کسی نے مشورہ دیا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرو۔ کسی نے بتایا گرم حمام میں نہاؤ۔ کسی نے بتایا۔ کھلی ہوا میں زور زور سے سانس لو۔ کسی نے سمجھایا۔ بند کمرے میں آنکھیں موند کر لیٹ جاؤ۔ اُس نے ہر ایک دوست کے مشورہ پر عمل کیا۔ لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اب اُس نے وئیدوں اور حکیموں کی دکانوں کا رُخ کیا۔ اور شربت عناب سے لیکر گندھک کے تیزاب تک ہر ایک رقیق شے کو پی گیا۔ لیکن اُسے زکام سے نجات نہ ملی۔ تنگ آکر اُس نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ایک ڈاکٹر نے تشخیص کی، کہ اُس کی ناک میں نقص ہے۔ دوسرے نے کہا اُس کے گلے میں خراش ہے۔ تیسرے نے بتایا۔ اُس کے بائیں پھیپھڑے میں ورم ہے۔ چوتھے نے کہا۔ دائیں میں سوزش ہے۔ پانچویں نے کہا۔ دونوں پھیپھڑے گل چکے ہیں۔ چھٹے نے ایک ایسے مرض کا نام بتایا جو تین سطروں میں بمشکل لکھا جا سکتا تھا۔ اُس نے ناک کا اپریشن کرایا۔ گلے میں دوا چھڑکوائی۔ پھیپھڑوں کو تقویت دینے کے لئے مچھلی کا تیل پیا۔ لیکن اُسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اُس نے گلے کا اپریشن کرایا۔ چونے کے انجکشن لئے۔ چھ ماہ ہسپتال میں رہا۔ لیکن اُسے بدستور چھینکیں آتی رہیں۔ جب وہ اپنا سارا اثاثہ ڈاکٹروں کی نذر کر چکا۔ تو اُسے بتایا گیا کہ اُسے اس لئے چھینکیں آتی ہیں۔ کہ اُس کی ناک میں لمبے لمبے بال ہیں۔ اِس اطلاع سے اُسے اتنا صدمہ پہنچا۔ کہ اُس نے خودکشی کر لی! ......

اُس نے خودکشی کر لی۔ آخر کیوں؟ کیا اُس کی بیوی بدصورت تھی؟ کیا وہ

دائم المریض تھا؟ کیا اس کا دیوالہ پٹ گیا تھا؟ نہیں۔ تو پھر؟ کیونکہ وہ جونکوں سے ڈرتا تھا۔ جونکوں سے؟ بہت بزدل نکلا۔ نہیں صاحب وہ بزدل نہیں تھا غیر معمولی جرأت کا مالک تھا۔ پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ کیونکہ یہ جونکیں بھی غیر معمولی تھیں۔ یہ وہ جونکیں تھیں جو جوہڑوں اور تالابوں میں رہنے کی بجائے مٹی کے گھرندوں میں رہتی ہیں۔ مثلاً ایک جونک تھی جسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کی مدد کرے تو وہ ناول لکھ سکتی ہے۔ یہ جونک ہر تیسرے دن اس کے دماغ سے چپک جاتی۔ اور جب تک نس نس کا خون چوس نہ لیتی علیحدہ نہ ہوتی۔ اس جونک کا مطالبہ تھا۔ کہ اسے پہلے ناول لکھنے کا ڈھنگ بتایا جائے۔ پھر کردار سازی کا طریقہ سمجھایا جائے۔ ناول کا پلاٹ مہیا کیا جائے۔ کردار بہم پہنچائے جائیں۔ اور اگر ہو سکے تو ناول لکھ کر اس کے سپرد کیا جائے۔ ایک جونک تھی۔ جسے باتیں بنانے کا شوق تھا۔ یہ جونک ہر چیز اور ہر مسئلہ کو تین قسموں میں منقسم کرتی اور انہیں شمار کرتے وقت ایک قسم ہمیشہ بھول جاتی۔ مثلاً انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔ زندہ دل اور مردہ دل اور تیسری قسم؟ تیسری قسم تو میں بھول ہی گیا۔ دوست تین اقسام کے ہوتے ہیں۔ فرشتہ سیرت اور ابلیس نما۔ اور تیسری قسم میں پھر بھول گیا۔ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ با مذاق اور بد دماغ۔ اور .... خیر تیسری قسم میں پھر بتاؤں گا۔ ایک وہ جونک تھی۔ جو ہر بات کا آغاز "کاش یوں ہوتا" سے کرتی تھی۔ "کاش میری زندگی میں کوئی خوبصورت عورت ہوتی"۔ "کاش میرے کپڑے پھٹے پرانے نہ ہوتے"۔ "کاش میری بیوی ذہین ہوتی"۔ "کاش میری لڑکی ہر سال امتحان میں فیل نہ ہوتی"۔ "کاش مجھے بواسیر کی شکایت نہ ہوتی"۔ ایک جونک اس سے

روپیہ کمانے کی تجاویز پوچھنے آتی تھی۔ "بسکٹ بنانے کی بھٹی لگا لوں؟ چڑیاں اور طوطے بیچنا شروع کر دوں؟ جوتے گانٹھنے کا کام کیسا رہے گا؟ سرمایہ کتنا درکار ہوگا؟ دکان کیسے ملے گی؟ آپ کتنا روپیہ قرض دے سکیں گے"؟ اسی طرح ایک جونک تھی۔ جسے اخبارات میں شکائتی خطوط چھپوانے کا مرض تھا۔ اس جونک سے اس کا تب تک چھٹکارا نہ ہوتا۔ جب تک وہ اُسے شکائتی خط کا مضمون تیار کر کے نہ دیتا۔ "آج میونسپلٹی کے خلاف خط لکھ دیجیے۔ آج یونیورسٹی والوں کو ڈانٹ بتائیے۔ آج لوگوں کی توجہ بنگال کے قحط کی طرف مبذول کرائیے۔ آج فلاں سڑک کی مرمت کے متعلق کارپوریشن کو کھری کھری سنائیے۔ آج بھنگیوں کی ہڑتال کے بارے میں کچھ لکھ ماریئے۔ آج جہیز کی رسم کے خلاف جہاد کیجیے۔ آج فلاں افسر کا پول کھول کر رکھ دیجیے۔"

متواتر پندرہ سال یہ جونکیں اس کا خون چوستی رہیں۔ اُس نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لیئے ہزاروں حیلے بہانے کیئے۔ لیکن بے سود۔ آخر تنگ آکر اُس نے یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو خودکشی کر لی۔

اُس نے خودکشی کر لی۔ کیا اُسے زکام تھا؟ کیا وہ جونکوں سے ڈرتا تھا؟ نہیں؟ اُس نے صرف شادی کی تھی۔ بس اتنی سی بات پر! ہاں صاحب۔ لیکن دراصل یہ "اتنی سی بات" نہ تھی۔ اُس کی شادی کے چند ماہ بعد اُس کا خسر، اُس کی ساس اُس کی بڑی سالی۔ اُس کے دو سالے غرضیکہ اُس کا سارا سسرال اُس کے ہاں چلا آیا۔ اُس کا خسر پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ اور "دخل در معقولات" کا قائل۔ وہ اپنے داماد کی ہر بات میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ "دیکھو میاں۔ تمہارا

فلاں دوست مجھے اوّل درجے کا کمینہ نظر آتا ہے۔ اسے منہ نہ لگاؤ"۔ "دیکھو صاحبزادے بیوی سے کبھی گستاخی سے مت پیش آؤ۔ نقصان اٹھاؤ گے"۔ "دیکھو عزیز۔ کھانا چبا چبا کر کھاؤ۔ ورنہ بدہضمی میں مبتلا ہو جاؤ گے"۔ دیکھو شریف زادے میری ہر بات پر عمل کرو۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے"۔

اُس کی ساس کا صرف ایک شغل تھا۔ اپنی بیٹی کی ہر بات میں حمایت کرنا۔ "میری زبیدہ۔ بچپن سے لاڈلی ہے۔ نوکر چاکر کیا۔ وہ تو ماں باپ پر حکومت کرنے کی عادی ہے"۔ "میری زبیدہ ایک دفعہ "نہ" کرنے کے بعد کبھی ہاں نہیں کرتی۔ چاہے کوئی مایوس ہو کر زہر کیوں نہ کھالے"۔ "میری زبیدہ جب روپیہ خرچ کرتی ہے۔ تو بخل سے کام نہیں لیتی۔ چاہے روپیہ کمانے والے کا دیوالہ ہی پٹ جائے"۔ "میری زبیدہ جب جلال میں آتی ہے تو حریف سخن کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے"۔

اس کے دونوں سالے بیکار تھے۔ جنہیں ڈنٹر پیلنے۔ پیٹ بھر کر کھانے اور اُس کے بہترین سیگرٹ چرانے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

اُس کی سالی چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم خاوند کو کوستی رہتی۔ "مَیں نے سو بار سمجھایا۔ اتنی شراب مت پیا کرو۔ لیکن وہ تو مرنے پر تُلا ہُوا تھا"۔ "مَیں کہتی ہوں اگر وہ احمق نہ ہوتا۔ تو ساری جائداد جوا میں کیوں ہارتا"۔ "میرا تو اُس دن نصیب پھوٹ گیا۔ جب احمد کی بجائے اُس سے میری منگائی ہوئی"۔ اُس کی سالی کا لڑکا وقت بے وقت اُس کی گود میں آ بیٹھتا۔ کبھی اُس کی عینک کا شیشہ توڑ ڈالتا۔ کبھی اُس کے قلم کی نب مروڑ دیتا۔ کبھی اُس کے نئے سُوٹ پر سیاہی کی بوتل انڈیل دیتا۔ کبھی اُس کی کتابیں پھاڑ ڈالتا۔ وہ جب اُسے

منع کرتا۔ تو مُنہ چڑاتا یا گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ اور اُس کی ماں بدتمیزی سے مُسکرانے یا ہنسنے لگتی۔

متواتر تین سال وہ خدا سے دُعا مانگتا رہا۔ کہ اُسے ان بن بُلائے کے مہمانوں سے چھٹکارا دلائے۔ لیکن اُس کی ایک بھی دُعا کارگر نہ ہوئی۔ جب اُس کے صبر کا پیالہ لبریز ہوگیا۔ تو اُس نے ایک دن نہایت شرافت سے راوی میں ڈوب کر خودکشی کر لی ؎

بے تکلّفی

کہنے کو تو اُستاد ذوقؔ فرما گئے۔ ؎

اے ذوقؔ تکلّف میں ہے تکلیف سراسر

لیکن یہ غور نہ فرمایا کہ اگر تکلّف میں تکلیف ہے۔ تو بے تکلّفی میں کونسی راحت ہے تجربہ شاہد ہے۔ کہ تکلّف، وہ تکلّف بھی جس کی معراج "پہلے آپ" ہے بے تکلّفی سے بدرجہا اچھا ہے۔ فرض کیجئے۔ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ اور جہنم کا داروغہ آپ سے کہتا ہے۔ "تشریف لے چلیئے"۔ اور آپ مُسکرا کر نہایت لجاجت سے عرض کرتے ہیں۔ "اجی پہلے آپ" تو عین ممکن ہے کہ آپ کے حسنِ اخلاق سے مرعوب ہو کر آپ کو جہنم کی بجائے جنّت میں بھجوا دے۔ اس کے برعکس اگر آپ کی داروغہ جنّت سے بے تکلّفی ہے۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ ہنسی مذاق میں وہ آپ کو باغِ بہشت

کی کسی نہر میں اتنے غوطے دلواتے۔ کہ آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتے۔

"تکلف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور ظاہر داری جُوں کی توں قایم رہتی ہے۔ مثلاً آپ کے گھر کوئی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں۔ "کچھ منگواؤں آپ کے لئے"۔ وہ فرماتے ہیں۔ "اجی صاحب تکلف مت کیجئے"۔

"چائے پئیں گے؟"

"شکریہ۔ ابھی پی ہے"۔

"سوڈا منگواؤں"۔

"نہیں صاحب آپ تو خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں"۔

"شربت پیجئے گا"۔

"واہ صاحب۔ آپ تو پھر تکلف پر اُتر آئے"۔

"ٹھنڈا پانی پیجئے"۔

"اچھا صاحب، اگر آپ اصرار کرتے ہیں، تو پی لیں گے"۔

اب اگر انہیں حضرت سے آپ کی بے تکلفی ہو، تو آپ کو کتنی زحمت اُٹھانی پڑے۔

"کھانا کھائیں گے آپ؟"

"ہاں ہاں ضرور کھائیں گے۔ لیکن کھانا کھانے سے پہلے چائے پئیں گے"۔

"چائے منگواؤں؟"

"ضرور منگوائیے۔ لیکن پہلے سگریٹ پلائیے"۔

"چائے کے ساتھ کیا کھائیے گا؟"

"اماں یاد تمہیں معلوم تو ہے۔ پاؤ بھر گاجر کا حلوہ۔ دو آملیٹ، چار توسٹ چند سنبوسے۔ دس بارہ کریم رول۔ اور ہاں ایک آدھ کیک ہو جائے تو سبحان اللہ۔ لیکن جلدی کیجئے۔"

بے تکلفی میں یوں تو ہزاروں قباحتیں ہیں۔ لیکن سب سے بڑی یہ کہ بسا اوقات اس کے طفیل آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ چند معزز اشخاص سے نہایت عالمانہ انداز میں کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ کہ کوئی صاحب دروازے پر اس طرح دستک دیتے ہیں۔ گویا دروازہ توڑ کر ہی دم لیں گے۔ وہ ایک منٹ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بلند آواز میں چلّانا شروع کر دیتے ہیں۔ "ابے حسینہ کہاں ہے۔ تو دروازہ کھول۔ ابے نا ہنجار۔ سنتا نہیں ہم کب سے چلّا رہے ہیں۔ ارے کوئی ہے۔ سب مر گئے کیا؟"

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ آپ کے احباب پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہیں۔ اور نہایت متانت سے کہتے ہیں۔ "معاف کیجئے گا صاحب۔ میری ان سے ذرا بے تکلفی ہے۔"

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ دو بے تکلف دوستوں کے درمیان کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ان میں سے ایک دوسرے کو نہایت غلیظ گالی دیتا ہے۔ اور آپ کی طرف عفو طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "برا نہ مانئے گا۔" دوسرا جواب میں ماں یا بہن کی گالی دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "معاف کیجئے گا۔ ہم بہت دنوں کے بعد ملے ہیں۔" اس معذرت کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ

شروع ہوتا ہے کہ آپ کو بے ساختہ اس بے تکلفی کی داد دینا پڑتی ہے۔

ناولوں میں بے تکلف دوستوں کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ تھیکرے ایک کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ صاحب جس دوست کے پاس ٹھہرتے تھے۔ رخصت ہوتے وقت اُس سے ایک قمیص ضرور مستعار لیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست اس معاملے میں تھیکرے کے اس کردار سے بازی لے گئے ہیں۔ وہ صرف قمیص پہ اکتفا نہیں کرتے۔ ساری پوشاک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عموماً ٹیکسی میں سوار ہو کر ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہی فرماتے ہیں "یار کچھ دیلے کا ایک نوٹ نکالئے۔ ڈرائیور کو دفع کر لوں۔ پھر باتیں کریں گے"۔ یہ حضرت ہمیشہ ہماری عدم موجودگی میں واپسی کا عزم کرتے ہیں۔ اور روانہ ہوتے وقت نوکر سے کہہ جاتے ہیں۔ "وہ آئیں تو انہیں کہہ دیجئے گا۔ کہ میں اُن کا گرم کوٹ، خاکی ٹائی اور کالی تپلون ساتھ لے جا رہا ہوں۔ چند دن استعمال کر کے واپس کر دوں گا"۔

ہمارے ایک اور بے تکلف دوست ہیں۔ وہ جہاں کہیں ہم سے ملتے ہیں مصافحہ کرنے کی بجائے بار بار بغلگیر ہو کر بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک بار انارکلی میں ملاقات ہو گئی۔ بازار کے بیچ انہوں نے یہ عمل جو دہرانا شروع کیا۔ تو راہگیر دانتوں میں اُنگلیاں داب کر رہ گئے۔ ہر دو منٹ کے بعد بغلگیر ہو کر کہتے۔ "بھئی خوب ملے۔ بار عرصہ ہو گیا"۔ وہ اس انداز سے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس رہے تھے۔ گویا برسوں کے بعد ملے ہیں۔ حالانکہ اس ملاقات سے صرف دو دن پہلے مال روڈ پہ ملے تھے۔ اور وہاں بھی اُنہوں نے اسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

بے تکلف دوست کی نوعیت مثال ہے۔ کہ اُسے وبالِ جان سمجھتے ہوئے

بھی آپ وہاں جا نہیں سکتے۔ اگر اس کے جی میں آئے، تو آدھی رات آپ کے گھر آ دھمکے۔ اور نہ صرف لذیذ کھانے کا مطالبہ کرے، بلکہ کہے کہ "سوئیں گے بھی یہیں اور سوئیں گے بھی آپ کے ساتھ"۔ دوپہر کے وقت آپ سو رہے ہوں، تو قینچی لے کر ازراہِ مذاق آپ کی دونوں مونچھوں کا صفایا کر ڈالے۔ شدت درد سے آپ کراہ رہے ہوں تو بدتمیزی سے آپ کا منہ چڑانا شروع کر دے۔ آپ مضمون لکھ رہے ہوں تو آپ کے ہاتھ سے مضمون چھین کر آتشدان میں پھینک دے۔

بعض اوقات بے تکلف احباب ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہ آپ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں۔ "ہائے تکلف! ہائے تکلف!!" ایک دفعہ مجھے دہلی جانا تھا گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ پلیٹ فارم پہ ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہو گئی۔ پوچھنے لگے "کہاں جا رہے ہو" میں نے کہا "دہلی" کہنے لگے "دہلی جا کر کیا کرو گے۔ چلو تانگہ لے چلیں"۔ میں نے معذرت چاہی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ یک لخت انہوں نے کہا "ذرا ٹکٹ دکھائیے تو" میں نے ٹکٹ دکھایا۔ ٹکٹ لے کر انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور قلی سے کہنے لگے "صاحب کا سامان واپس لے چلو۔ انہوں نے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے"۔

انہیں صاحب نے ایک بار اس سے بھی عجیب حرکت کی۔ ایک دن میں دریا کے کنارے کھڑا ہوا۔ غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے آپ کہاں سے آ ٹپکے آپ نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پیچھے سے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا پانی میں جا گرا۔ آپ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر فرمانے لگے۔ "واہ خوب چھلانگ لگائی آپ نے"۔ جب میں بڑی مشکل سے تیر کر کنارے کے قریب پہنچا، تو ایک قہقہہ لگا کر

کہنے لگے۔" مجھے معلوم نہ تھا۔ آپ اتنے اچھے تیراک بھی ہیں"۔

"تکلف کے خلاف آپ جو چاہیں کہیں لیکن آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ تکلف سراسر نفاست ہے اور بے تکلفی سراسر کثافت۔ "تکلف" پہلے آپ" ہے۔ تو بے تکلفی " پہلے ہم اور جہنم میں جائیں آپ" ہے۔ تکلف گز بھر لمبا گھونگھٹ ہے تو بے تکلفی گز بھر لمبی زبان۔ تکلف زیرِ لب مسکراہٹ ہے تو بے تکلفی خندۂ بیباک۔

اب اگر اس پر بھی اُستادِ ذوق فرمائیں۔ کہ "تکلف میں سراسر تکلیف ہے"۔ تو ہم تو یہی کہیں گے۔" صاحب آپ کو بے تکلف دوستوں سے پالا ہی نہیں پڑا!"

صداقت

ایک دفعہ نجانے خدا کو کیا سوجھی کہ اُس نے چلّا کر کہا۔ "صداقت!" چشم زدن میں دُنیا میں صداقت کا ڈنکا بجنے لگا۔ اور بیچارہ جھوٹ دُم دبا کر دنیا سے بھاگ گیا۔ تمام لوگ حتیٰ کہ وکلاء اور سیاست دان بھی سچ بولنے لگے۔ چنانچہ جب اُس دِن مسٹر پی پی مکرجی بار ایٹ لاء اپنے موکل سیٹھ رام دیال کی طرف سے کہ جس نے قتل کا جرم کیا تھا۔ ہائیکورٹ میں پیش ہوئے۔ تو اُنہوں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مائی لارڈ! میرا موکل سیٹھ رام دیال پرلے درجے کا بدمعاش ہے۔ اس سے پہلے وہ چار دفعہ قتل کے جرم کا ارتکاب کر چکا ہے۔ اور ہر بار مشہور و معروف وکلا کی مدد اور اپنے رسُوخ سے قانون کے شکنجے سے بچتا رہا ہے۔ اُس نے مجھے خود بتایا کہ اُس نے مقتول کو معمولی سی بات پر پستول کا نشانہ بنایا۔ اور اگر اُس کا بس

چلتا تو وہ مقتول کی بیوی اور بچوں کو بھی قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے مقتول کو اس بیدردی سے قتل کیا ہے کہ وہ سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہے۔ اس کے تمام گواہ جھوٹے ہیں۔ کیونکہ ان سب نے رشوت لے کر گواہی دی ہے۔ مائی لارڈ! میں عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ مبلغ تین ہزار روپے جو میں نے بطور فیس ملزم سے لئے تھے۔ وہ میں آپ کی موجودگی میں اسے واپس کرتا ہوں۔ مائی لارڈ! مجھے بے حد مسرت ہوگی۔ اگر سیٹھ رام دیال جیسا شہلا دو غنڈہ کیفر کردار کو پہنچے"۔

(۹)

سیاستدانوں کی ایک محفل میں وزیر اعظم نے ایک پسماندہ ملک کے نمائندہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تقریر کی "جناب من! امر واقعہ یہ ہے کہ ہم آپ کے ملک پر اس لئے حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ہمیں پٹرول اور مٹی کے تیل کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ ہم آپ کو تہذیب سکھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک تہذیب کا سوال ہے۔ آپ کا ملک ہمارے ملک سے کہیں مہذب ہے۔ پٹرول اور تیل کے علاوہ ہماری آنکھ آپ کے گندم کے ذخیروں اور سونے چاندی کی کانوں پر بھی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ فوجی لحاظ سے آپ کا ملک اتنا کمزور ہے کہ اسے دیکھ کر بیساختہ ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کافی تعداد میں ٹینک اور بمبار ہوتے تو ہم کبھی آپ کے ملک کا رخ نہ کرتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں آپ کے ملک کو لوٹنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ آپ بدقسمتی سے کمزور واقع ہوئے ہیں۔ اور اس وقت دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے"۔!

(۴۳)

کمال موویٹون والوں نے اپنی نئی فلم کا اشتہار مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:۔

ہماری تازہ فلم کا نام "دھما دھم مست قلندر" ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔
کتنا بیہودہ نام ہے۔ کہانی ڈائریکٹر صاحب نے لکھی ہے۔ جنہیں کہانی لکھنے کا مطلقاً تجربہ نہیں۔

دراصل انہوں نے یہ کہانی ہالی وڈ کی چار فلموں سے چرائی ہے۔ لیکن اس سرقہ کے باوجود کوئی بات پیدا نہیں کر سکے۔ مکالمے اور گانے ایک ایسے شخص نے لکھے ہیں۔ جس کا نام لیتے ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے یہ فلم صرف روپیہ کمانے کی غرض سے بنائی ہے۔ اس لئے آرٹ، اخلاق اور خوش ذوقی کو بالائے طاق رکھ کر اسے تیار کیا گیا ہے۔ ہمیں تعجب نہ ہوگا۔ اگر اسے ایک بار دیکھنے کے بعد آپ ہم پر ساری عمر لعنت بھیجتے رہا کریں۔ ساری فلم میں ایک منظر بھی دیکھنے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ان تمام نقائص کے باوجود اگر آپ ہماری سرپرستی فرمائیں تو یقیناً آپ سے بڑا احمق کوئی نہ ہوگا۔ ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر اس فلم کا نام "دھما دھم مست قلندر" کی بجائے "محض بکواس" ہوتا تو یہ فلم کی بہتر ترجمانی کرتا۔"

(۴۴)

نہانے کا صابن تیار کرنے والی ایک کمپنی نے اپنے اشتہار میں لکھا۔

"حضرات! ہم عرصہ سے اپنے صابن کے اشتہار میں لکھ رہے ہیں۔ کہ اس میں چربی استعمال نہیں کی گئی۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اس کے اجزاء میں چربی کافی مقدار میں شامل کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم چربی استعمال نہ کریں۔ تو ہم یہ صابن بنا ہی

نہیں سکتے۔ اگر بنا بھی لیں تو اس قیمت میں آپ کو نہیں دے سکتے۔ ہم اس امر کی توضیح کر دینا چاہتے ہیں۔ کہ ہم نے مشہور فلم سٹارز کو معقول رشوتیں دیکر اس صابن کے متعلق اُن کی رائیں حاصل کی ہیں۔ ورنہ فلم سٹارز اتنی سادہ لوح نہیں۔ کہ اپنی جلد کی حفاظت کے لئے اس قسم کے گھٹیا صابن کا استعمال کریں۔ ہم عموماً یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ کہ اس صابن کی "کوالٹی" میں پچھلے سالوں سے کوئی تغیر نہیں آیا۔ یہ بات بھی دوسری باتوں کی طرح بالکل جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہمارا صابن مقبول خاص و عام ہوا ہے۔ ہم نے اس کے اجزا سے زیتون کا تیل نکال کر سرسوں کا تیل شامل کر دیا ہے۔"

(۵)

ایک پیٹنٹ دوا کے اشتہار باز نے اپنے پچھلے اشتہاروں میں اس طرح ترمیم کی :-

"حضرات! آپ واقعی بہت سادہ لوح واقع ہوئے ہیں۔ کہ ہماری چکنی چپڑی باتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ آپ سے کس مسخرے نے کہا۔ کہ "شاشوشن" تمام امراض کی واحد دوا ہے، ذرا سوچئے تو سہی۔ کہ یہ کیسے ممکن ہے "شاشوشن" دراصل چھوٹے کا پانی ہے جس میں ہم نے تھوڑا سا لال رنگ اس لئے شامل کر رکھا ہے کہ آپ کو اس دوا کی اصل حقیقت کا پتہ نہ چل سکے۔ ممکن ہے، یہ دوا ایک آدھ مرض میں مفید ثابت ہو۔ لیکن اس کا بیک وقت ہیضہ، پلیگ، اور گٹھیا کے لئے مفید ہونا ایک ایسی گپ ہے جس پر صرف بے وقوف انسان ہی یقین کر سکتا ہے۔ ہم نے اس دوا کی قیمت پانچ روپے فی بوتل مقرر کر رکھی ہے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے۔ کہ

ہماری لاگت پانچ آنے بھی نہیں۔ باقی رہے سارٹیفکیٹ۔ ان میں سے تین چوتھائی فرضی ہیں۔ اور باقی ہم نے دوستوں اور رشتہ داروں سے لکھوائے ہیں۔ یہ تو حاکم وقت کی ہمارے حال پر مہربانی سمجھئے کہ ہمیں اس دوا کے بیچنے کی کھلی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ اگر اس دوا کے متعلق ہمارے دعوؤں کی جانچ پڑتال کی جائے تو ہمیں اس وقت جیل میں ہونا چاہیئے۔"

(۶)

ایک لمیٹڈ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنی کمپنی کے پراسپکٹس میں لکھا:۔

"ہم چند بیکار لوگوں نے ملکر یہ کمپنی کھولی ہے۔ ہمارا مقصد نہایت واضح ہے یعنی لوگوں کی جیب سے پیسہ نکال کر اپنی جیبیں گرم کرنا۔ ہم پبلک کو سو سو روپے کے دس ہزار حصے خریدنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس دس لاکھ روپیہ آجائیگا۔ ہم یہ روپیہ چند مہینوں میں ہضم کر جائیں گے۔ اور اس کے بعد کمپنی کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کریں گے۔ اس کمپنی کو معرض وجود میں لانے سے قبل ہم مختلف ناموں سے متعدد جعلی بنک، کمپنیاں اور تجارتی ادارے قائم کر چکے ہیں۔ لیکن پبلک۔ یعنی آپ لوگ کچھ ایسے بے سمجھ واقع ہوئے ہیں۔ کہ ایک دفعہ نقصان اٹھانے کے باوجود پھر ہمارے چنگل میں آپھنستے ہیں۔ "ہندوستان کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا" جو ہماری کمپنی کا قصب العین ہے، دراصل ایک بہت بڑا ڈھونگ ہے۔ لیکن اگر آپ کو اس قسم کے سبز باغ نہ دکھائیں تو آپ کا تعاون کیسے حاصل کریں"۔

(۷)

ایک ڈاکٹر نے ایک مریض کو یہ مشورہ دیا:۔

"جناب من! آپ بالکل بھلے چنگے ہیں۔ مَیں محض اپنا اُلّو سیدھا کرنے کیلئے آپ کو طرح طرح کے وہم میں مبتلا کرتا رہا ہوں۔ اصل میں میرا مقصد دہشت پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ مَیں جان بوجھ کر خطرناک امراض کے لمبے لمبے نام لیکر آپ کو محتاط رہنے کی تلقین کرتا رہا۔ مَیں نے آپ کے خون، تھوک، پیشاب کا اس لئے امتحان کرایا۔ کیونکہ مَیں نے ہر ڈاکٹر کے ساتھ کمیشن مقرر کر رکھی ہے۔ آپ کی چھاتی میں مطلقاً کوئی نقص نہیں۔ آپ کے سینہ میں وقتاً فوقتاً جو درد اُٹھتا ہے اُسکی وجہ "بدہضمی" ہے۔ "دق" نہیں۔ اگر آپ خوراک کے معاملے میں تھوڑی سی احتیاط برتیں تو آپ دو چار دِن میں صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ وہ جو بارہ ٹیکے مَیں نے آپ کے بازوؤں میں گھونپے۔ اُن میں نمک کے پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس امر کے باوجود مَیں نے یہ کہہ کر کہ ان میں سونے اور چاندی کے مرکبات شامل ہیں۔ آپ سے سینکڑوں روپے بٹورے۔ ان ٹیکوں کا آپ کو یہ فائدہ ہُوا کہ آپ پہلے سے بھی کمزور ہو گئے۔ اور آپ میں چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ آپ میرے پاس نہ آتے۔ تو آپ کے تندرست ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔"

(۸)

ایک پروفیسر نے ایک طالب علم کو سارٹیفکیٹ دیتے ہوئے کہا:۔

"مَیں تصدیق کرتا ہوں کہ رام دیال اوّل درجے کا نالائق ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جماعت میں کبھی نچلا نہیں بیٹھا۔ ہر روز لڑکیوں پر کاغذ کے غبارے۔ چاک کے ٹکڑے اور کیلے کے چھلکے پھینکا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب مَیں تختہ سیاہ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر بھی دو گلے سڑے انڈے پھینکے۔ وہ انگریزی لکھ سکتا ہے نہ پڑھ

سکتا ہے۔ کیونکہ جس وقت میں انگریزی پڑھاتا تھا۔ وہ مزے سے چلغوزے کھایا کرتا تھا۔ اُس کی عادتیں غایت درجہ گندی گھناؤنی ہیں۔ کام چور وہ اتنا ہے کہ آج کا کام کل کی بجائے پرسوں پر چھوڑتا ہے۔ میں نے اُس جیسا گستاخ اور زبان دراز طالب علم زندگی بھر میں نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ جب میں نے اُسے ایک مضمون میں فیل کر دیا۔ تو اُس نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ جو شخص رام دیال کو ملازم رکھے گا۔ وہ ایک ایسی مصیبت مول لے گا۔ جس کا کوئی علاج نہیں۔ میری دانست میں رام دیال طالب علم نہیں "چلتی پھرتی لعنت" ہے۔

(۹)

صداقت کا یہ دور زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس نئے دور میں سینکڑوں لوگ بیکار ہو گئے۔ ہزاروں بھوکوں مرنے لگے۔ چوروں ٹھگوں اور راہزنوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ تجارت۔ کاروبار اور صنعت و حرفت میں پہلی سی گہما گہمی نہ رہی۔ کائنات پر ایک گہری افسردگی چھا گئی۔ اور جب خدا نے آسمانوں سے جھانک کر زمین کی طرف دیکھا تو اُسے اپنے بندوں پر بے حد ترس آیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ پکار کر کہتے "اے خالقِ دو جہاں اپنا حکم واپس لے لے"۔ اُس نے اپنا حکم واپس لے لیا ؛

نئی کتابیں

نام کتاب	مصنف	مترجم	قیمت روپے	نئے پیسے
اپنی منزل - اپنی راہیں	ولیم سرویان	نریندر نشچل	۲	۵۰
عزم جوان	ہیرلڈ رسل - و - وکٹر روزن	راج نرائن ایم اے	۱	۵۰
طوفان کے بعد	برونو سٹرن	راج نرائن ایم اے	۳	۵۰
آرزو کی کلیاں	جان سٹین بیک	مخمور جالندھری	۱	۷۵
دنیا کے مشہور سائینسدان	ولیم الیور سٹیونز	مخمور جالندھری	۲	۲۵
شکستِ ظلمت	دین وائٹ بروکس	مخمور جالندھری	۱	۷۵
نورا	جارج مائیکس	اقبال اختر	۲	۵۰
بابی ڈگ	ہیرل میبول	چندر موہن لانبہ	۲	۰۰
ابراہیم لنکن	سٹرلنگ نارتھ	چندر موہن لانبہ	۲	۰۰

انڈین اکیڈیمی - ۶ - بی - ریگل بلڈنگ - نئی دہلی

(محبوب المطابع پریس اُردو بازار - دہلی)